www.urducouncil.nic.in
قیمت: -/15 ₹

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

نئی دہلی

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

جون 2026

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس و ٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

- کہکشاں ◆ زبان شناسی
- میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب
- بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 15 روپے   سالانہ: 145 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرتعاون سالانہ 145 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 ، A/C: IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 040 - 24415194

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

نئی دہلی

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 10 شمارہ: 6 جون 2026

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شمس اقبال

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

معاون مدیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: میکاف پرنٹرس، B-127، سیکٹر 65
نوئیڈا۔201301 (یوپی)

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/15 روپے، سالانہ -/145 روپے

صفحات: 64 Total Pages

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 011-49539000
شعبۂ ادارت: 011-49539009

نگارشات ارسال کرنے کے لیے
ای میل: kduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد- 500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ
اداریہ		
مشعل	مدیر	4
شخصیت		
سمن کلیانپور: گائیکی کا ایک دور ختم ہوا	خورشید اکرم	5
جہان نسواں		
1970 کے بعد خواتین افسانہ نگار	اعجاز علی ارشد	9
تبسم فاطمہ کے افسانوں میں عورت کا باغیانہ تیور	واثق الخیر	14
راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں میں خواتین کے مسائل	محمد شاداب شمیم	20
فلک چومنے کی کوشش کرتی بیٹیاں	ممتاز شیریں	25
اردو اور میتھلی کے لسانی رشتے	زیبا پروین	28
ادب میں سائنسی تصورات کی پیش کش	سیدہ نازیہ فاطمہ	31
صادقہ نواب سحر کی نظموں میں نسائی شعور کی تشکیل	ایم ریحانہ پروین	37
یوگا اور خواتین		
خواتین کی زندگی میں یوگ کی اہمیت	اسنیٰ سحر	42
یوگا خواتین کی صحت اور اعتماد کی نئی راہ	نوی رضا خان	48
حسن سخن		
غزلیں	فرحانہ نازنین	51
غزلیں	شفا مریم	52
نظم	زبیدہ شکیل	53
افسانے		
ہم سفر	فوزیہ حبیب	54
یادوں کا سفر	یاسمین	58
قارئین کے خطوط		
تاثرات		62

مشعل

قدیم وجدید علوم وفنون کا بنیادی مقصد انسانیت کی فلاح رہا ہے۔آئندہ متعارف ہونے والے علوم کا مقصد بھی انسانی زندگی کی کامرانی ہوگا۔ ہر زبان کے کتب و رسائل علوم سے مملو ہیں۔اب یہ انسان کی اہلیت و لیاقت پر منحصر ہے کہ وہ ان سے کس قدر فیض حاصل کرتا ہے۔تاہم زندگی کو کامیاب و متحرک بنانے کے لیے جسمانی طور پر متحرک رہنا پڑے گا۔اسی لیے ابوالکلام آزاد اور دیگر رہنماؤں کا اصول تھا ورزش کرنا۔ورزش کرنے والے انسان ذہنی وجسمانی طور پر مضبوط ہوتے ہیں اعصاب کی مضبوطی کا براہ راست اثر قوت ارادی پر پڑتا ہے جس سے فیصلہ لینے کی صلاحیت پر مثبت اثر پڑتا ہے۔یوں تو ورزش میں تنوع پایا جاتا ہے لیکن میدان عمل محدود ہونے کے باعث بالخصوص خواتین کے لیے یوگا سب سے کارآمد ہے۔آپ اپنے آنگن، کھلی چھت حتیٰ کہ اپنے برآمدے اور کمرے میں بآسانی یوگا کرسکتے ہیں۔

یوگا خواتین کی مجموعی صحت کے لیے ایک انتہائی مؤثر قدرتی طریقہ علاج ہے۔تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ یوگا اور مراقبہ مردوں کے مقابلے میں خواتین کی جسمانی اور ذہنی صحت پر زیادہ مثبت اثرات مرتب کرتے ہیں۔یوگا سے خواتین جسمانی، ذہنی اور روحانی سطح پر فیض حاصل کرسکتی ہیں۔آج کے دور میں جہاں انسان بے شمار پریشانیوں میں گھرا ہوا ہے ان پریشانیوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے اور جسمانی وذہنی صحت کو بہتر بنانے کے لیے یوگا بے حد مفید سمجھا جاتا ہے۔یوگا ایک ایسی پرسکون ورزش ہے جس سے انسان کی جسمانی وذہنی صحت پر اچھے اور مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

یوگا بہت سی بیماریوں سے نجات دیتا ہے۔ہر ورزش مجموعی طور پر خواتین کے لیے قدرتی علاج ہے۔یوگا اور مراقبے سے جسمانی اور ذہنی صحت پر زیادہ مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ذہنی سکون ملتا ہے۔ڈپریشن، بے چینی اور تھکن سے نجات ملتی ہے۔یوگا سے روحانیت کو ترقی ملتی ہے اور روحانیت ایک شہری کو بہتر طور طریقہ، سلوک اور خوش اخلاق بنانے میں بہتر کردار ادا کرتا ہے۔گویا یوگا پابندی سے کیا جائے تو انسان کے اندر ڈیسپلن پیدا ہوتا ہے جس سے تادم حیات انسان چاق و چوبند رہتا ہے۔''ماہنامہ خواتین دنیا'' نے خاص طور پر اس ماہ کے شمارے میں خواتین کو یوگا کے فوائد پر لکھے گئے مضامین کی صورت میں ایک تحفہ دینے کی کوشش کی ہے تاکہ خواتین خود اپنی صحت کی دیکھ بھال کرسکیں اور اپنی زندگی کو بہتر بنا سکیں۔

آپ کا

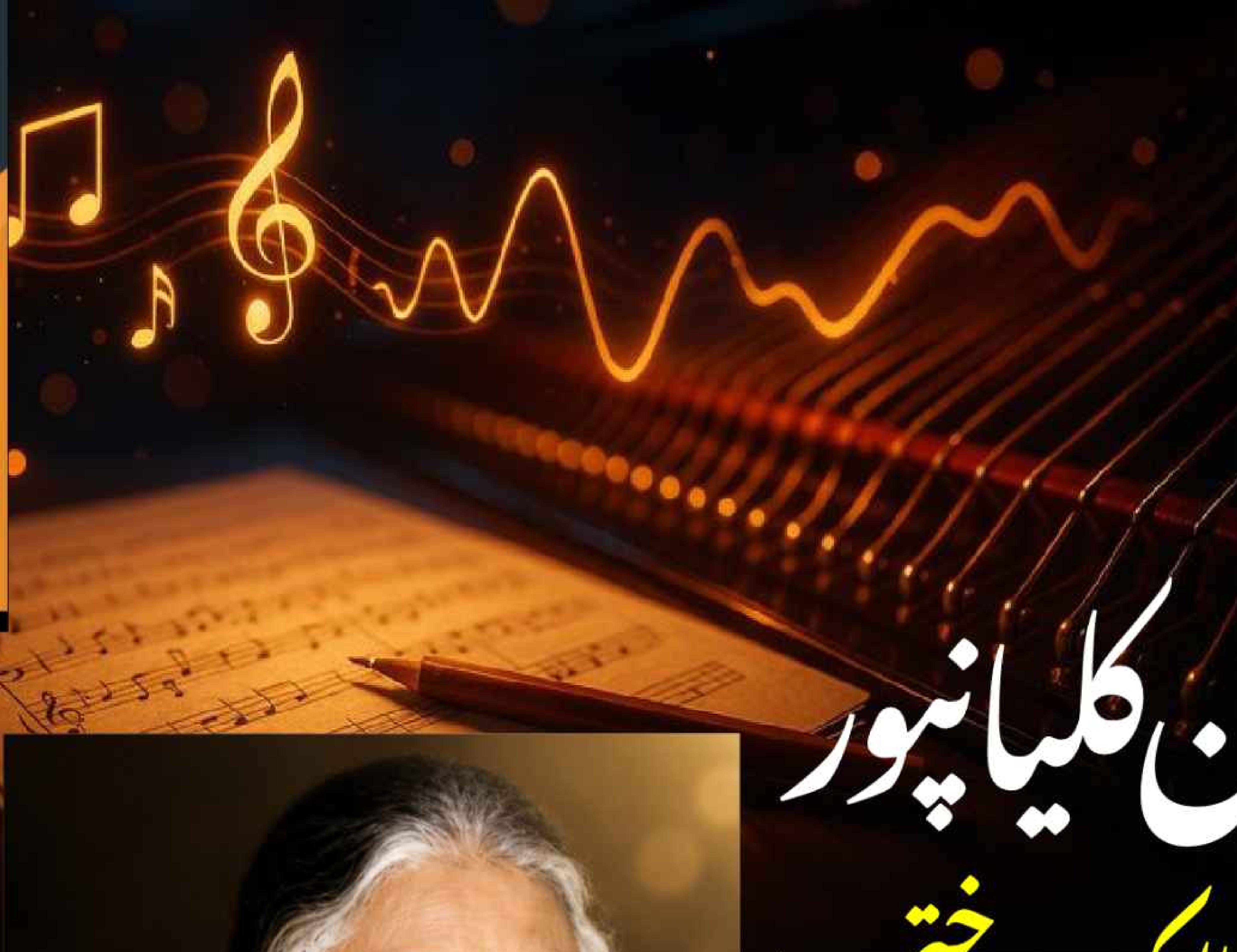

خورشید اکرم

سمن کلیانپور

گائیکی کا ایک دور ختم ہوا

گیت ہندوستانی ثقافت کا سب سے اہم حصہ ہے۔ شادی بیاہ کے موقع پر اور فصلوں کی بوائی کٹائی کے موقعوں پر گیت گانے کا رواج ہندوستانی معاشرے میں صدیوں سے جاری ہے۔ اسی طرح پریم اور برہا کے گیت بھی ہر زبان اور سماج میں گائے جاتے رہے ہیں۔ فلمی صنعت نے ہندوستان کی اسی لوک روایت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فلموں میں گیتوں کو بڑی اہمیت دی۔ ہندوستان کی پہلی بولتی فلم 'عالم آرا' 1931 میں بنی۔ وزیر محمد خان کے گائے دو مصرعوں "دے دے خدا کے نام پہ بندے۔۔۔ ہمت ہے گر دینے کی / لے لے خدا کے نام پہ بندے۔۔۔ ہمت ہے گر لینے کی" کو پہلا فلمی گیت بننے کا شرف حاصل ہوا۔ اس طرح فلمی گیتوں کا سفر شروع ہوا۔ ہندوستانی فلموں کو عوامی مقبولیت دلانے میں سب سے بڑا رول گیتوں کا ہے۔ گیت سنگیت اور گائیکی کے مثلث نے پچھلے سو سال میں ہندوستانی معاشرے پر جو اثرات مرتب کیے ہیں، اس کا کوئی ثانی کسی اور ملک اور معاشرے کے پاس شاید نہیں ہو۔ ابتدائی طور پر فلمی گیتوں میں کلاسیکی اندازِ موسیقی اور گائکی کا اثر زیادہ تھا لیکن دھیرے دھیرے موسیقاروں نے اور گیت کاروں نے خواص میں مقبول خالص کلاسیکی انداز سے الگ ہٹ کر اور لوک روایت کے قریب جا کر گیت سنگیت اور گائیکی کے ایک نئے انداز کی بنیاد ڈالی جو عوام اور خواص دونوں میں مقبول ہوا۔ چالیس کی دہائی سے فلمی گیت کا ایک سنہرا دور شروع ہوتا ہے جو ستر کی دہائی تک بہت کامیابی سے چلتا ہے۔ اس دور کے گانے آج بھی عوام کے درمیان مقبول ہیں۔ چالیس کی دہائی کے بعد جب ہندوستانی فلموں کو ایک سے ایک اچھے ہدایتکار اور اداکار ملنے لگے اسی زمانے میں بہترین موسیقار، گیت کار اور گلوکار بھی سامنے آئے۔ موسیقاروں میں ایک طرف ایس ڈی برمن، سی رامچندر، نوشاد، روی، روشن، خیام، او پی نیر، مدن موہن، غلام حیدر جیسے غیر معمولی صلاحیت کے لوگ

تھے تو گیت کاروں میں ساحر لدھیانوی، مجروح سلطان پوری، شکیل بدایونی ، شیون رضوی، بھرت ویاس، کوی پردیپ، پریم دھون ، حسرت جے پوری ، ایس ایچ بہاری وغیرہم نے اپنے سدابہار گیتوں سے ہندوستانی فلموں کوثروت مند بنایا۔لیکن گیت اورسنگیت کوعوام تک پہنچانے میں سب سے بڑا رول گلوکار کا ہوتا ہے۔ چنانچہ کے ایل سہگل، محمد رفیع، طلعت محمود، منا ڈے، ہیمنت کمار، مکیش اور کئی دیگر گلوکار سامنے آئے۔اسی طرح گلوکاراؤں میں نور جہاں، زہرا بائی امبالے والی، امیر بائی کرناٹکی، پارل گھوش، راجکماری وغیرہ کا شہرہ تھا۔ان کے ساتھ ہی گیتوں کے افق پر گیتا دت ، ثریا، لتا منگیشکر، مبارک بیگم، شمشاد بیگم اورآشا بھونسلے کا نام روشن ہوا۔سمن کلیانپوراور سدھا ملہوترا بھی کم وبیش اسی زمانے میں سامنے آئیں۔ 40 سے ستر کے سنہرے دور کے ان گلوکاروں اور گلوکاراؤں کی آوازیں برسوں گزر جانے کے بعد آج بھی لوگوں کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔اس دور کی آخری گلوکاراؤں میں آشا بھونسلے اورسمن کلیانپور تھیں۔ ابھی آشا بھونسلے کی وفات (12 اپریل2026) کا غم تازہ ہی تھا کہ 31 مئی2026 کوسمن کلیانپور بھی اس عالم فانی سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئیں۔سمن کلیانپور فلم گائیکی کے سنہرے دور کی آخری کڑی تھیں۔ان کے ساتھ فلمی گیتوں سے وابستہ موسیقاروں، گیت کاروں اورگلوکاروں کا ایک دور ختم ہوگیا۔

سمن کلیان پور کے دس بہترین گانے

- نانا کرتے پیار تم ہی سے کر بیٹھے (فلم جب جب پھول کھلے 1965)
- آج کل تیرے میرے پیار کے چرچے (فلم برہمچاری 1968)
- تم نے پکارا اور ہم چلے آئے (فلم راج کمار 1964)
- میرے محبوب نہ جا (فلم نور محل 1965)
- دل ایک مندر ہے (فلم دل ایک مندر 1963
- ٹھہریئے ہوش میں آلوں تو چلے جایئے گا (فلم محبت اس کو کہتے ہیں 1965)
- چھوڑو کل کی باتیں (فلم ہم ہندوستانی 1960)
- پربتوں کے پیڑوں پر شام کا بسیرا ہے (فلم شگون 1964)
- یہ کس نے گیت چھیڑا (فلم میری صورت تیری آنکھیں 1963)
- میرا پیار بھی تو ہے، یہ بہار بھی تو ہے (فلم ساتھی 1968)

سمن کلیانپور کا اصلی نام سمن ہیماڈی تھا۔ان کا جنم 28 جنوری 1937 کوڈھاکہ میں ہوا تھا، جہاں ان کے والد ملازمت کے سلسلے میں سکونت پذیر تھے۔1942 میں وہ اپنے خاندان کے ساتھ بمبئی آگئے۔سمن نے شوقیہ گانا شروع کیا تھا۔لیکن گائیکی میں ان کی دلچسپی بڑھنے لگی تو انھوں نے استاد خان عبدالرحمٰن خان اور گوروجی ماسٹر نورنگ سے موسیقی اور گائیکی کی باضابطہ تعلیم حاصل کی۔ گلوکاری کا ان کا سفر آل انڈیا ریڈیو سے1952 میں شروع ہوا۔ پھر انھیں ایک مراٹھی فلم میں گیت گانے کا موقع ملا۔ اس کے بعد ان کا گائیکی کا سفر آگے ہی آگے کی طرف بڑھتا گیا، یہاں تک کہ وہ ہندوستانی فلمی گائیکی کا ایک اہم نام بن گئیں۔

ہندوستانی فلموں میں سمن کلیانپور کا گائیکی کا سفر1954 میں فلم منگو کے گیت' کوئی پکارے دھیرے سے مجھے' سے شروع ہوا تھا۔ تاہم انھیں پہلا بڑا بریک ایس ڈی برمن نے اتفاق سے دیا تھا۔ جب1962 میں انھوں نے سمن کلیان پوراور ہیمنت کمار کی آواز میں ایک یادگار دوگانا 'نہ تم ہمیں جانو/ نہ ہم تمھیں جانے/مگر لگتا ہے کچھ ایسا / میرا ہمدم مل گیا' گوایا۔ یہ اتفاق اس لیے ہوا تھا کہ ان دنوں ایس ڈی برمن کی لتا منگیشکر سے لڑائی چل رہی تھی۔ایس ڈی برمن نے سمن کلیانپور کولتا کا متبادل بنا کر پیش کرنے میں کامیابی حاصل کی۔

دراصل سمن کلیانپور اور لتا منگیشکر کی آواز میں بہت مشابہت تھی۔ دونوں کی آواز مہین تھی۔ لتا منگیشکر نے جب گانا شروع کیا تھا اس زمانے میں ہندوستانی فلموں میں نور جہاں، زہرا بائی امبالے والی، امیر بائی کرناٹکی، پارل گھوش، راجکماری وغیرہ جیسی گلوکاراؤں کا بول بالا تھا۔ لتا منگیشکر کی عظمت اس بات میں پوشیدہ ہے کہ انھوں نے ان بڑی گلوکاراؤں کے زمانے میں اپنی ایک الگ پہچان بنانے کی کوشش کی۔

لتا کی آواز سے مشابہت سمن کلیان پور کے حق میں بھی گئی اور ان کے خلاف بھی۔ حق میں یوں کہ بہت سے گیت جو انھوں نے گائے، سننے والوں نے ان کی پذیرائی لتا کے گیت سمجھ کر کی۔ ان کے متعدد گیتوں کو مقبولیت لتا کی آواز سمجھ کر ملی۔ تاہم ان کے خلاف یہ بات گئی کہ خود ان کا اپنا کوئی انداز، اپنی کوئی پہچان نہیں بن پائی۔ لتا سے اپنی آواز کی مشابہت پر وہ کہتی تھیں کہ یہ ان کے بس میں نہیں کہ وہ اپنی آواز کو بدل لیں۔ وہ گویا لتا کے سائے میں ہی رہ گئیں۔ لتا منگیشکر نے جب گائیکی کی شروعات کی وہ نور جہاں سے بہت متاثر تھیں۔ لیکن انھیں ماسٹر غلام حیدر اور انل وشواس جیسے موسیقار ملے جنھوں نے لتا کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ نور جہاں کی پرچھائیں سے باہر نکلیں اور خود اپنا انداز اختیار کریں۔ شاید سمن کلیان پور کو ایسا کوئی نہیں ملا۔

سمن کلیانپور کو لتا منگیشکر کی سی آواز اور انداز کا فائدہ تب ملا جب 60 کی دہائی میں لتا منگیشکر اور محمد رفیع کے بیچ جھگڑا ہو گیا۔ رفیع اور لتا کی جوڑی نے ہندوستانی فلمی گیتوں میں بے پناہ اضافے کیے ہیں۔ لیکن جب دونوں نے مل کر نہ گانے کا فیصلہ کیا تو فلمی دنیا میں کھلبلی مچ گئی۔ اس زمانے کے موسیقار اور ہدایت کار اور فلم ساز آواز کی اس جوڑی کو کھونا نہیں چاہتے تھے۔ اس وقت کے فلمی گیتوں کی مارکیٹ میں رفیع اور لتا کے دوگانوں کا بہت بڑا حصہ ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ اسی زمانے میں سمن کلیان پور کو لتا کی آواز کی مشابہت کی وجہ سے یادگار دوگانے گانے کا موقع ملا، جس کا انھوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ سمن نے محمد رفیع کے ساتھ 'آج کل تیرے میرے پیار کے چرچے ہر زبان پر' اور 'تم نے پکارا اور ہم چلے آئے' جیسے کئی ہٹ دوگانے گائے۔

تاہم یہ سمجھنا بھول ہوگی کہ لتا منگیشکر اور سمن کلیانپور میں کوئی مسابقت یا عداوت تھی۔ لتا منگیشکر کا قد بہت اونچا تھا اور سمن کلیانپور اپنی نوعمری میں ان کے گانوں کی فین رہی تھیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان دونوں (لتا اور سمن) نے ایک گانا 'کبھی آج کبھی کل' ساتھ مل کر بھی گایا تھا۔ یہ فلم چاند (1959) کا گیت تھا جو مینا کماری اور بلراج ساہنی کی فلم تھی۔

سمن کلیانپور کی ازدواجی زندگی بہت خوشگوار تھی ان کے شوہر راما نند جی کلیان پور تھے جن سے انھوں نے اپریل 1958 میں شادی کی تھی اس کے بعد ہی ان کے نام کے ساتھ کلیانپور جڑا۔

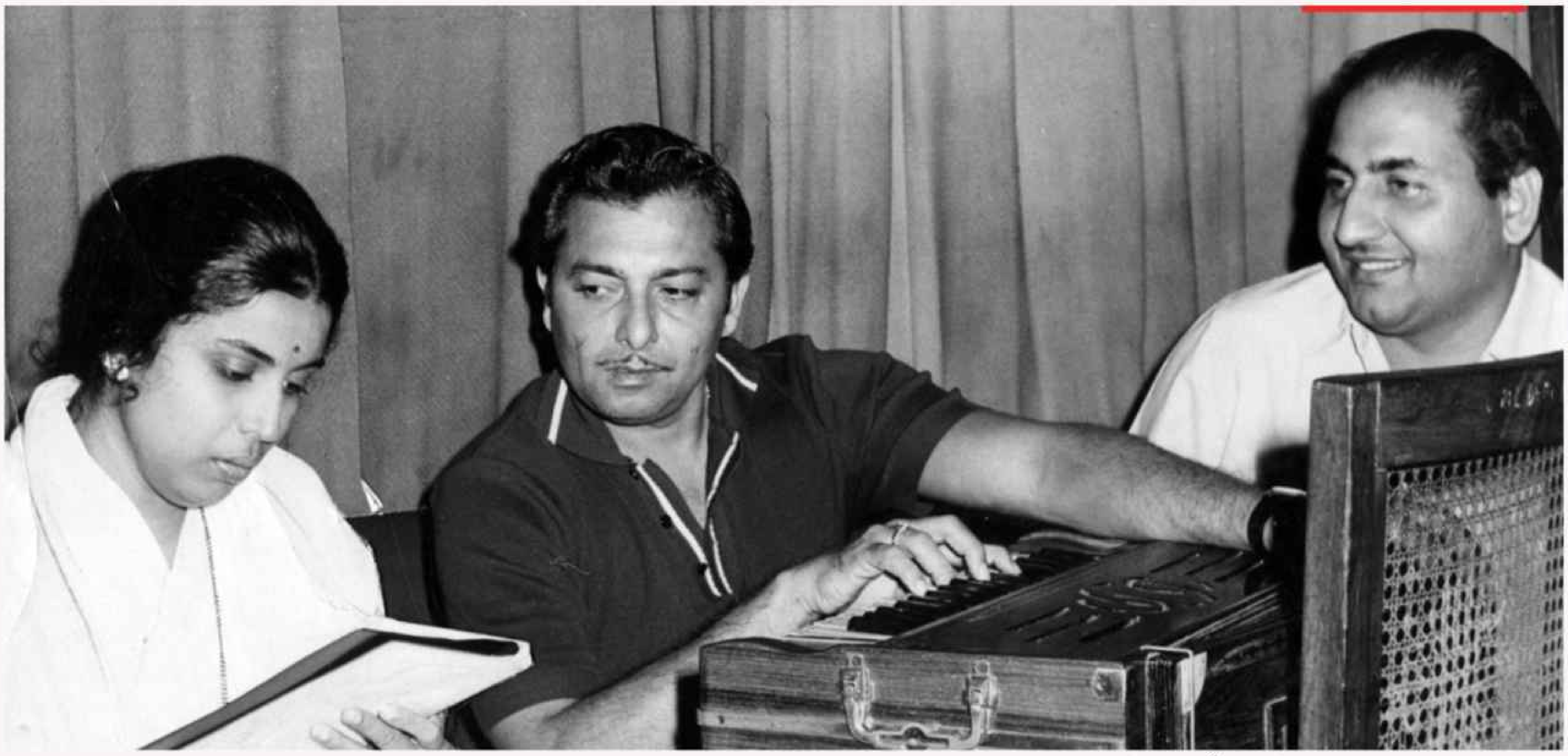

راما نند جی نے سمن کلیانپور کی گائیکی کے کیریئر کو بڑھانے میں ان کا بہت ساتھ دیا۔ انھوں نے سمن کو اپنی توجہ صرف گانے پر مرکوز رکھنے کی آزادی اور چھوٹ دی۔ انھوں نے اپنے گھر اور بچوں کی بھی دیکھ بھال کی۔ بتایا جاتا ہے کہ جن دنوں سمن اسٹوڈیو میں گانوں کی ریکارڈنگ کے لیے مصروف رہتی تھیں، اس زمانے میں گھر کی ساری ذمہ داری ان کے شوہر دیکھتے تھے۔ ان کی ازدواجی زندگی محبت اور مسرت بھری تھی۔ ان کے شوہر کا انتقال 2006 میں ہوا تھا۔

سمن کلیانپور کے مزاج میں بڑی سادگی تھی۔ لیکن ان کی آواز میں پہاڑی جھرنوں والی چنچلتا اور روانی تھی۔ جس کا نمونہ 'آج کل تیرے میرے پیار کے چرچے' اور 'تم نے پکارا اور ہم چلے آئے' اور 'نا نا کر کے پیار تم ہی سے کر بیٹھے' جیسے گیتوں میں دیکھ سکتے ہیں انھوں نے اردو/ ہندی کے علاوہ مراٹھی ،بنگلہ ، گجراتی ، کنڑ، بھوجپوری، اڑیا ،پنجابی اور دیگر زبانوں میں گیت گائے جن کی تعداد ساڑھے سات سو سے زیادہ ہے۔ سمن کلیانپور کی آواز سنیما ریڈیو اور ریکارڈوں کے ذریعے گھر گھر پہنچی اور لوگوں کی یاد کا حصہ بن گئی۔

ان کے بے شمار گانے مثلاً 'نہ تم ہمیں جانو' یا 'میرے محبوب نہ جا آج کی رات نہ جا' یا 'دل ایک مندر ہے' یا 'بہنا نے بھائی کی کلائی سے پیار باندھا ہے' یا 'پربتوں کے پیڑوں پر شام کا بسیرا ہے' یا 'میرا پیار بھی تو ہے یہ بہار بھی تو ہے' وغیرہ ساٹھ سال سے بھی زیادہ عرصے سے عوام کے حافظے میں محفوظ ہیں۔

ہندوستانی زندگی میں ان کی بیش بہا خدمات کے پیش نظر 2023 میں انھیں ملک کے اعلی شہری اعزاز پدم بھوشن سے نوازا گیا تھا۔

ان کی ارتھی پر جمع ہوئی فلمی ہستیوں، مداحوں اور پریوار کے لوگوں نے انہی کے گائے گیت 'رہیں نہ رہیں ہم، مہکا کریں گے، بن کے کلی، بن کے صبا، باغِ وفا میں' گا کر انہیں وداعی دی۔

❒❖❒

Khurshid Akram
Flat No.: 73-B, Pocket-A
Sukhdev Vihar
New Delhi- 110025

1970 کے بعد خواتین افسانہ نگار

اعجاز علی ارشد

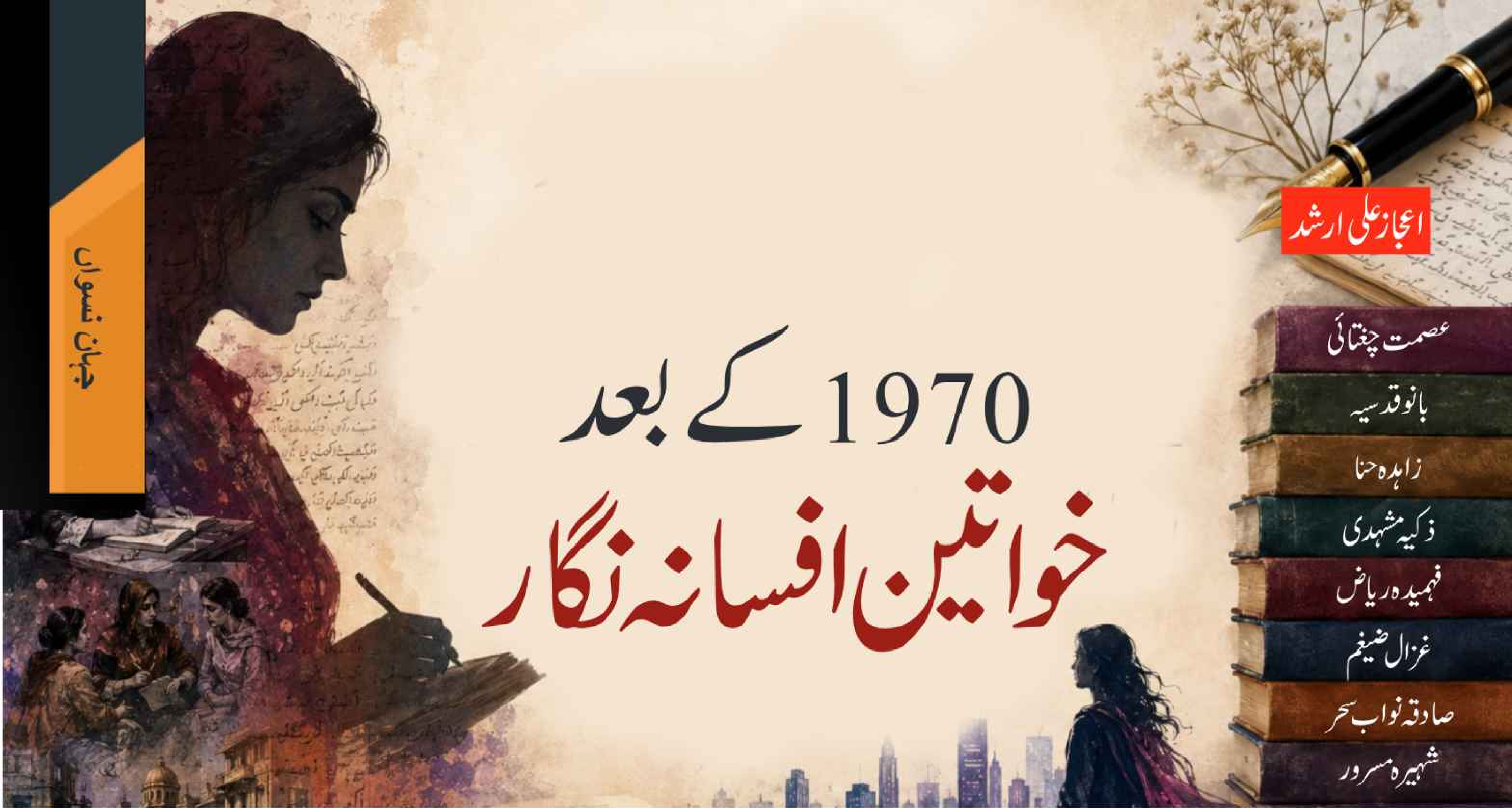

اس سے قبل کہ میں موضوع کے حوالے سے کچھ عرض کروں، یہ واضح کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ شعروادب بھی زندگی کی طرح ایک تسلسل کے ساتھ چلتا ہے۔ یہ ایک مسلسل تخلیقی عمل ہے جونشیب وفراز کے درمیان بے حدسبک روی کے ساتھ جاری رہتا ہے۔ اس لیے اپنی سہولت یا مطالعے کی ضرورت کے تحت ہم اسے علاقائی یا زمانی اعتبار سے تقسیم کرسکتے ہیں مگر یہ دعویٰ نہیں کرسکتے کہ حال یا مستقبل کا ادب ماضی قریب سے بالکل مختلف ہوگا۔ یہی صورت پیش نظر موضوع کے مطالعے میں بھی سامنے آتی ہے۔ اکبری بیگم، عباسی بیگم (حجاب امتیاز علی کی والدہ)، محمدی بیگم، نذرسجاد حیدر اور صغریٰ ہمایوں مرزا وغیرہ تو خیر ہماری ابتدائی ادبی تاریخ کا حصہ ہیں مگر 1970 کے بعد بھی جن خواتین کے افسانے منظرعام پر آئے ان کا مطالعہ خلا میں رکھ کر نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ان افسانہ نگاروں میں بھی ایک بڑی تعداد ان خواتین کی ہے جو آزادی کے بعد یعنی بیس پچیس سال قبل سے ہی لکھ رہی تھیں اور بعد کے دنوں میں بھی دس پندرہ سال لکھتی رہیں۔ دوسری وہ ہیں جنھوں نے 1970 کے بعد ہی لکھنا شروع کیا۔ ایسی تمام خواتین کا سرسری تذکرہ بھی کیا جائے تو کوئی نہ کوئی نام چھوٹ جائے گا اور دس پندرہ صفحات لکھنے کے باوجود واضح موضوعاتی تقسیم محال ہوگی اس لیے مجموعی طور پر میں trends اور رجحانات کے حوالے سے گفتگو کروں گا۔ البتہ دوران گفتگو مخصوص حوالوں اور ناموں کا آنا گزیر ہے۔

ابتدا میں ہی یہ بھی عرض کردوں کہ 1970 کے پہلے سے جو خواتین افسانے لکھ رہی تھیں ان کے موضوعات اور اسالیب بھی یکساں نہیں تھے بلکہ ان کے یہاں موضوع اور طرز اظہار دونوں کی سطح پر خاصا تنوع اور فرق تھا۔ اگر ہم رشید جہاں سے بھی آغاز کریں تو کم از کم ایک درجن ایسی قابل ذکر خواتین افسانہ نگاروں کے نام ہمارے سامنے آجاتے ہیں جنھوں نے مخصوص اور محدود موضوعات پر سہی مگر مختلف زاویوں سے اظہار خیال کیا ہے۔ اب غور کیا جائے تو 1970 کے آس پاس برصغیر ہندو پاک میں ایک نئ تہذیبی، لسانی اور بالاخر سیاسی تحریک کا آغاز ہوا ہے جو دسمبر 1971 میں ایک نئے ملک کے قیام تک پہنچی ہے لیکن اردو فکشن یا خواتین افسانہ نگاروں پر اس کے محدود اثرات ہی مرتب ہوئے ہیں اور روایت کی پاسداری بھی جاری رہی ہے۔

اس سلسلے میں دوسری اہم بات تانیثیت یا نسائیت سے خواتین افسانہ نگاروں کی وابستگی ہے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ایک طرف تو ہم آزادیٔ نسواں اور مردوں کے ساتھ ان کی برابری کی بات کرتے ہیں اور دوسری طرف ہر خاتون افسانہ نگار کو پابند کرنے یعنی تانیثیت کے تصور یا تحریک سے وابستہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ میرا پہلا سوال یہی ہے کہ عورت کے لیے صرف ان ہی جذبات و مسائل پر

قلم اٹھانا کیا ضروری ہے جو عورتوں سے متعلق ہوں۔ یہ کسی خاتون افسانہ نگار کی ترجیح ہو سکتی ہے مگر پابندی نہیں کیونکہ جب پوری دنیا اس کی نگاہ میں ہے تو اس کے قلم کی دسترس میں بھی ہونی چاہیے۔

حجاب امتیاز علی تاج کی والدہ عباسی بیگم (وفات: 1928) یا ہمایوں مرزا کی اہلیہ صغریٰ ہمایوں نے اگر پردے کی مخالفت اور تعلیم نسواں کی حمایت میں آج سے ایک سو سال پہلے کچھ کہا تو یہ ان کی روشن خیالی اور آنے والے زمانے سے واقفیت کا ثبوت ہے صرف اپنے درد و غم کا اظہار نہیں۔ ظاہر ہے کہ رسم و رواج دنیا سے آشنائی کا رنگ بعد کی خاتون افسانہ نگاروں کے یہاں بھی کسی نہ کسی حدتک موجود رہا مگر بہت سارے دوسرے لوگوں کی طرح میں بھی یہی ماننے پر مجبور ہوں کہ احتجاج کی باضابطہ اور واضح صورت میں یہ پہلی بار عصمت چغتائی کے افسانوں میں ابھرا۔

دراصل ناقدین کا یہ طرز فکر اردو افسانوں کے سرسری مطالعے کا نتیجہ ہے۔ اگر ہم تلاش وجستجو سے کام نہ لیں تو ایک عمومی مطالعہ ہمیں یہی احساس دلاتا ہے کہ ابتدا سے لے کر کم از کم تیں چالیس برسوں تک خواتین افسانہ نگاروں کا عام مزاج رومانی اور اصلاحی رہا، انقلابی نہیں۔ وہ مروجہ اخلاقیات کے دائرے میں رہ کر وفاداری اور بے وفائی کے درد بھرے قصے سناتی رہیں مگر نہ تو انھوں نے دنیا کے وسیع تر موضوعات کو سمجھنے کی کوشش کی نہ Protest کے کسی عام رجحان کا حصہ بنیں۔ شاید اسی لیے گزشتہ صدی میں بہت دنوں تک اردو کی تمام خاتون افسانہ نگاروں کو یا تو رومانی اور اصلاحی طرز فکر کا حامل قرار دیا گیا، یا کسی نہ کسی طور پر تانیثیت کی تحریک سے وابستہ کر کے یہ فرض کر لیا گیا کہ ان کا اپنے عہد اور معاشرے کے عمومی مسائل سے زیادہ لینا دینا نہیں ہے اور خود اپنے ہی مسائل کی نشان دہی کرتے ہوئے احتجاج کی آواز بلند کر لیں تو بہت ہے۔

میرا خیال ہے کہ اس ذہنی رویے اور اس کے عملی اظہار پر کسی حدتک مرد اساس معاشرے کا بھی اثر رہا مگر اس کی حیثیت اردو کی خواتین افسانہ نگاروں پر ایک الزام تراشی سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے۔ صرف ایک مثال دیتا ہوں۔ حجاب امتیاز علی تاج کی والدہ عباسی بیگم (وفات: 1928) یا ہمایوں مرزا کی اہلیہ صغریٰ ہمایوں نے اگر پردے کی مخالفت اور تعلیم نسواں کی حمایت میں آج سے ایک سو سال پہلے کچھ کہا تو یہ ان کی روشن خیالی اور آنے والے زمانے سے واقفیت کا ثبوت ہے صرف اپنے درد وغم کا اظہار نہیں۔ ظاہر ہے کہ رسم و رواج دنیا سے آشنائی کا رنگ بعد کی خاتون افسانہ نگاروں کے یہاں بھی کسی نہ کسی حدتک موجود رہا مگر بہت سارے دوسرے لوگوں کی طرح میں بھی یہی ماننے پر مجبور ہوں کہ احتجاج کی باضابطہ اور واضح صورت میں یہ پہلی بار عصمت چغتائی کے افسانوں میں ابھرا۔

عصمت چغتائی کے افسانوں اور ان کی بے باکی سے ہم سب واقف ہیں اور ان امور کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔ میں بس اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ ہم ان کے انداز بیان سے جتنا چاہیں اختلاف یا انحراف کریں مگر انھوں نے اردو افسانے کو جو نئی سمت و رفتار عطا کی اس سے انکار نہیں کر سکتے۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ ان کے لذت آمیز یا چٹخارے دار اسلوب کی زیادہ پیروی نہیں ہوئی اور ہو بھی نہیں سکتی تھی کیونکہ ایک واجدہ تبسم نے کچھ دنوں تک شعوری طور پر یہ انداز اختیار کیا تو ''اترن'' کی طرح شعروادب کے وجود سے الگ کر دی گئیں۔ حالانکہ ان کے یہاں فحاشی کے پس پردہ مسلسل اور تاریخی جبر کی شکار ایک عورت کا جو جذبۂ انتقام پوشیدہ تھا اس پر کبھی تفصیل سے گفتگو نہیں ہوئی۔ بہر حال، عصمت کی جرأت اظہار نے دوسری خواتین کو بھی اپنا درد دل شہر در شہر سنانے کا حوصلہ دیا۔ نہ صرف یہ کہ ہر عمر کی خواتین کے مسائل و مصائب تواتر کے ساتھ پیش ہونے لگے بلکہ ہندو پاک کی ادبی فضا میں کم از دو درجن ایسی خواتین افسانہ نگاروں کا ظہور ہوا جنھوں نے اپنی محدود نسائی دنیا سے باہر نکل کر

اس وسیع وعریض کائنات کے نوع بہ نوع موضوعات کو افسانوں میں جگہ دی۔ حالانکہ عصمت کے یہاں جنسی بے راہ روی کے جو مناظر اور پہلو بیان ہوئے تھے وہ کسی نہ کسی طور پر آج بھی موجود ہیں مگر خواتین افسانہ نگاروں نے اپنے اس احساس کو عملی روپ دیا کہ اب ان کا تذکرہ ضروری نہیں کیونکہ اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ نام لینا چاہوں تو کہہ سکتا ہوں کہ نگار عظیم نے کچھ دنوں تک جنسی مسائل کو موضوع بنایا اور غزال ضیغم نے تانیثی رویوں پر نئی تکنیک کے ساتھ قلم اٹھایا مگر دوسری خواتین کے یہاں موضوعات کا تنوع قابل دید بن گیا۔ ممبئی کی خستہ حال چالوں سے لے کر یورپ اور مشرق وسطیٰ کی عیش گاہوں تک کے اچھے اور برے احوال سامنے آئے۔ انفرادی اور اجتماعی استحصال کے مناظر بھی دکھائے گئے۔ ایک طرف ذکیہ مشہدی نے کچرا چننے والوں(Rig Pickers) کو اپنی ایک کہانی میں کردار بنایا تو صادقہ نواب سحر نے حیدرآباد کے ان غریب خاندانوں کی داستان لکھی جن کی نوعمر بیٹیاں ساٹھ ستر سال کے عربوں سے بیاہ دی جاتی ہیں اور یہ سلسلہ نسل در نسل چلتا رہتا ہے۔ کچھ حد تک سماجی صورت حال بھی ان کے افسانوں کا موضوع بنی۔ صارفی کلچر کی جلوہ سامانی، بزرگوں کی ناقدری، بچوں کی بے راہ روی اور بیشتر انسانوں کی تنہائی بھی خواتین افسانہ نگاروں نے بیان کی۔ یہ قابل قدر سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

ظاہر ہے کہ تمام تر افسانوں کا ذکر یہاں ممکن نہیں۔ لیکن ایک دو نام سامنے آگئے تو چند اہم موضوعات کے حوالے سے چند اور مثالیں دینے کا دل چاہتا ہے۔ ہمیں علم ہے کہ 1970 کے بعد سماج کی فرقہ وارانہ تقسیم زیادہ نمایاں ہوگئی۔ فسادات ہوئے، دوریاں بڑھیں اور نہ صرف ایک شہر سے دوسرے شہر بلکہ ایک محلے سے دوسرے محلے کی طرف ہجرت کا سلسلہ شروع ہوا۔ یادیں پرانی جگہوں پر رہ گئیں اور لوگ نئے علاقوں میں بس گئے۔ اس سے بہت سارے سماجی، ثقافتی اور تہذیبی مسائل پیدا ہوئے جن میں سے کچھ بین المذہب محبتوں بلکہ Inter religion marriage کے تھے۔ آج Live in Relations کے زمانے میں یہ ایک عام سا موضوع ہوسکتا ہے مگر آج سے پچاس برس پہلے کے ماحول میں جانکی رمن پانڈے اور روشن آرا کے ازدواجی رشتے پر بے حد توازن اور تخلیقی ہنرمندی کے ساتھ افسانہ (قصہ جانکی رمن پانڈے) لکھ کر ذکیہ مشہدی نے خواتین قلم کاروں کو مردوں کے دوش بدوش چلنا سکھایا۔ یہی نہیں اگر اس زمانے کے ایک اور اہم موضوع یعنی دلت طبقے کے مسائل کو سامنے رکھیں تب بھی وہ آگے کی صف میں کھڑی ہیں۔ چمرٹولی کی پنکی ایک ایسا کردار ہے جو اردو کے علاوہ دوسری زبانوں میں بھی موجود ہے مگر ذکیہ مشہدی 'ایک مکوڑے کی موت' میں ڈھنیا جیسا کردار پیش کرتی ہیں جس کے لیے بھر پیٹ پوری سبزی کھانا بھی خواب جیسا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بے بسی بے مثال ہے اور ''پوسٹر'' کے کرداروں سے کسی طرح کم نہیں۔

یہاں سرحد پار کی دو تین خواتین کا تذکرہ ضروری ہے۔ سرفہرست تو فہمیدہ ریاض ہیں جو شاعرہ کی حیثیت سے بھی مشہور ہوئیں مگر ان کے بعض افسانے اپنے عہد سے آگے کی تحریر تصور کیے گئے اور بہت مقبول ہوئے۔ انھوں نے غیر شادی شدہ اور شادی شدہ دونوں طرح کے افراد کے درمیان Extra Marital relations کی نہ صرف آئینہ داری بلکہ تائید کی۔ ان کی ہم وطن اور ہم عصر اور ایک بری عورت کی آتم کتھا، لکھنے والی کشور ناہید اور ''سرگوشی'' تک محدود رہنے والی لالی چودھری بھی گرچہ زیر لب احتجاج کا ہی نمونہ ہیں مگر ان کا حوصلہ قابل تعریف ہے۔ کچھ ایسا ہی حوصلہ شہناز نبی نے ہجڑوں پر ایک کہانی لکھ کر دکھایا تھا۔ ان کا افسانہ 'کبڑوں کی بستی' بھی بہت مشہور ہے مگر صارفی کلچر کے سبب رشتوں کی ناپائداری اور اپنوں کی بے وفائی کے موضوع پر مجھے یاسمین اختر کی کہانیوں نے بہ وجوہ زیادہ متاثر کیا۔

یہاں کچھ ذاتی یادیں شیئر کرنا چاہتا ہوں۔ میں 1985 میں پہلی بار انگلینڈ گیا تھا۔ ان دنوں اخبارات میں جگہ بہ جگہ ایسے اشتہار دیکھ کر مجھے پہلے تو حیرت اور پھر وحشت ہوئی جن میں funerals کے لیے جگہ کی فراہمی سے لے کر ہر طرح کے مذہبی اور سماجی انتظامات کرنے کے اخراجات شامل تھے۔ برسوں بعد بشریٰ اعجاز کا

افسانہ ''فاصلے ہی فاصلے'' پڑھا تو اندازہ ہوا کہ عنقریب قبر کی جگہ حاصل کرنے کے لیے بھی پگڑی دینی پڑے گی۔ یہ 'دوگز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں' جیسا کوئی شکوہ نہیں بلکہ صارفی کلچر کا نتیجہ ہے۔ اور پھر مجھے ''ثروت خاں'' کی کہانی ''لوک عدالت'' بھی خود بخود یاد آ گئی جس میں راجستھان کے ایک راج پوت قبیلے میں مردوں کی موت پر رونے اور ماتم کرنے کے لیے معاوضے پر عورتیں بلائی جاتی ہیں۔

ایک اور ذاتی تجربہ بیان کرنا چاہتا ہوں۔ موقع محل کی مناسبت بلکہ نزاکت کے سبب بس اشاروں تک ہی محدود رہوں گا۔ لندن میں گھومتے ہوئے مجھے کئی بار ایک سوال سننے کو ملا۔ Do you want business? یہی سوال سنگاپور میں بعض خواتین کی زبان سے اس طرح ادا ہوا— Do you want company

میں واپس آیا تو کئی بار اس بر سر عام دعوت وصال کو یاد کر کے حیرت زدہ بھی رہا اور شرمندہ بھی۔ مگر ان ہی دنوں میں نے ایک ایسی خاتون افسانہ نگار کی داستان پڑھی جو محض اپنی پڑوسن سے گفتگو کرنے کی پاداش میں شوہر پر بے وفائی کا الزام لگا کر اس سے علیحدگی پر آمادہ تھیں۔ میں اب تک یہ سمجھ نہیں پایا کہ ہمارے موجودہ سماج میں جنسی بے راہ روی کے تازہ ترین تصور پہ گفتگو کب شروع ہوگی؟

آخر میں بس دو اور افسانہ نگار خواتین کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ ایک تو زاہدہ حنا ہیں اور دوسری شہیرہ مسرور۔ ویسے تو زاہدہ حنا کا افسانہ ''آنکھوں کے دیدباں'' بھی زیرلب احتجاج کی خوب صورت مثال ہے مگر میں ''کُم کُم بہت آرام سے ہے'' کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جس کی کہانی ہمارے اپنے شہر کلکتہ (اب کولکتا) سے لے کر کابل تک پھیلی ہوئی ہے۔ افسانہ تکنیک کے اعتبار سے بھی کچھ الگ ہے یعنی خط کے فارم میں ہے۔ اس میں موجودہ نسل کی ایک سماجی کارکن کُم کُم اپنی نانی کو خط لکھتی ہے جس میں بچپن کے حوالے سے ناخدا مسجد اور برلا مندر کا بھی ذکر آتا ہے اور ٹیگور کی کہانی ''کابلی والا'' کا بھی۔ مگر سب سے دردانگیز تین نسلوں کا وہ فاصلہ ہے جس نے قحط بنگال کو موجودہ کابل کے قحط سے ہم آمیز کر دیا ہے اور اس غذائی قلت کے نتیجے میں ٹیگور کی کہانی کا کردار اب اس قدر بے بس ہو گیا ہے کہ وہ کُم کُم جیسی کم عمر لڑکی کا دیا ہوا پیسہ واپس نہیں کرتا، قبول کر لیتا ہے۔ عنوان کے اختتام تک کہانی اس قدر مربوط اور اثر انگیز ہے کہ بے ساختہ آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ Topical Issues پر لکھی گئی ایسی کہانیاں آج کی خواتین افسانہ نگاروں کے لیے ایک مثال بن سکتی ہیں۔

شہیرہ مسرور نے علامت نگاری سے کام لیا ہے یہ اچھی بات ہے۔ ان کی ایک کہانی ''نسلوں کی کیل پر ٹنگا لمحہ'' بہت مشہور ہے مگر ایک عورت کا اپنی بیٹی کو اور اس بیٹی کا اپنی بیٹی تمنا کو یہ سمجھانا کہ عورت کے لیے جھکنا ناگزیر ہے، مجھے زیادہ پسند نہیں آیا۔ اس کے برعکس ان کا افسانہ 'لفظوں کی دکان'، میری نظر میں اپنے موضوع یعنی دہشت گردی اور تکنیک یعنی علامت نگاری دونوں اعتبار سے قابل توجہ ہے۔ دہشت گردی کی دردناک فضا کو ویسے تو ترنم ریاض نے بھی اپنے افسانے ''کشتی'' میں پیش کیا ہے مگر شہیرہ مسرور نے اس رویے کی طرف ہماری توجہ دلانی چاہی ہے جس کے زیر اثر بعض رنگوں کی طرح لفظوں کو بھی ایک خاص طبقے یا مذہب کے ساتھ منسوب کر دیا گیا ہے۔ انھوں نے صارفی کلچر کے ان اثرات کی بعض اور افسانوں میں بھی نشان دہی کی ہے جو رشتوں کو بے حد عارضی بناتے جا رہے ہیں۔ مگر میں مزید تفصیل میں نہ جاتے ہوئے بس ایک افسانے کا اور تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جس میں کولکتا نئے انداز سے جلوہ گر ہے۔ یہ تازہ ترین کہانی ایک مرد کی زبان سے بیان ہوئی ہے مگر سراسر عورتوں کی داستان ہے۔ کہانی ایوان اردو، دہلی کے تازہ شمارے نومبر-دسمبر 2025 میں ''ونڈرلینڈ'' کے نام سے شائع ہوئی ہے اور کلکتہ کی فلمی دنیا کے ساتھ ممبئی کی فلمی دنیا کا خوب صورت تقابلی جائزہ پیش کرتی ہے۔ اس موضوع پر خواتین بھی لکھ سکتی ہیں کیونکہ فلمی دنیا واقعی ایک ونڈرلینڈ ہے جہاں ہر روز ایک نئی کہانی جنم لیتی ہے اور بھی بہت سارے قومی اور عالمی موضوعات ممکن ہیں مثلاً غزہ کی صورت حال، بزرگوں کی ناقدری، انفرادی آزادی کی شکل میں بڑھتی ہوئی جنسی آزادی، نصاب کے بوجھ میں غائب ہوتی ہوئی بچوں کی معصومیت، خانگی زندگی پر فضائی

آلودگی اور ٹریفک جام کے اثرات یا بڑھتے ہوئے ورک کلچر کے انسانی زندگی پر اثرات جسے ایک شاعر نے بڑی ٹھیٹ بھاشا میں اس طرح بیان کیا ہے۔

غضب تمھاری نوکری صبح سے آٹھ
آٹھ برس کے بیچ میں دونوں بن گئے کاٹھ

اسی طرح ایک اور خاتون افسانہ نگار غزالہ قمر اعجاز روایتی موضوعات کے ساتھ ساتھ نوٹ بندی اور نیٹ بینکنگ جیسے تازہ موضوعات کو بھی افسانہ بنا دے رہی ہیں۔ لیکن افسانہ نگاری کے لیے موضوعات طے کرنا نقاد کا منصب نہیں اس لیے بس اشارہ کافی ہے۔

> **''دوسری اہم بات یہ ہے کہ 1970 سے قبل کی خواتین افسانہ نگاروں نے جو افسانے لکھے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ اردو فکشن کی عظیم عمارت میں سنگ بنیاد یا نیو کی اینٹ جیسے ہیں بلکہ مختلف قومی اور بین الاقوامی مسائل و احوال اور تحریکات و رجحانات کی آئینہ داری کرتے ہیں۔''**

مجھے احساس ہے کہ گفتگو طویل ہوتی جارہی ہے مگر موضوع کے حوالے سے دو تین نکات اور پیش کرنے ضروری ہیں۔ ایک تو یہ کہ گزشتہ صدی کے آخری دہائیوں سے لے کر موجودہ صدی کی دوسری بلکہ موجودہ دہائی تک خواتین افسانہ نگاروں کا جائزہ لیجیے تو فوراً اندازہ ہوجاتا ہے کہ خواتین نے ان تمام موضوعات پر قلم اٹھانا شروع کردیا ہے جن پر مرد افسانہ نگار ہی لکھ رہے تھے۔ صرف ایک مثال دیتا ہوں۔ شوکت حیات نے ''گنبد کے کبوتر'' اور ذکیہ مشہدی نے ''افعی'' کے نام سے افسانے لکھے ہیں جو بابری مسجد کے المیے پر ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ دونوں ہم وطن بھی اور بڑی حد تک ہم عصر بھی۔ مزید دلچسپی کا پہلو یہ ہے کہ اور بھی کئی قلم کار اس موضوع پر قلم اٹھا چکے ہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ 1970 سے قبل کی خواتین افسانہ نگاروں نے جو افسانے لکھے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ اردو فکشن کی عظیم عمارت میں سنگِ بنیاد یا نیو کی اینٹ جیسے ہیں بلکہ مختلف قومی اور بین الاقوامی مسائل و احوال اور تحریکات و رجحانات کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ اس لیے جیسا کہ میں نے ابتداء میں عرض کیا موجودہ افسانوں کا جائزہ لیتے ہوئے اس پس منظر اور تسلسل کو نظرانداز کرنا غلط ہوگا۔ اس سلسلے کی تیسری اور اہم ترین بات یہ ہے کہ ویسے تو ہر زمانے میں احتجاج کے لیے ہنرمندی اور سلیقے پر زور دیا گیا ہے مگر موجودہ عہد میں ناخداؤں کو خدا بننے کی بیماری ہوگئی ہے اس لیے ہم خوب صورتی کے ساتھ شکوہ نہیں کرسکتے تو ہمارے کاز کو نقصان پہنچ سکتا ہے اور خود ہماری ذات کو بھی۔ جہاں تک خواتین کے مسائل کا تعلق ہے کسی نے یہ عجیب و غریب بات بھی کہی ہے کہ عورت خود نہیں جانتی کہ وہ چاہتی کیا ہے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ یہ بھی عورتوں پر ایک طرح کا الزام ہی ہے۔ یہ درست ہے کہ بیسویں صدی کی عورت بنیادی طور پر صرف اپنی جذباتی اور نفسیاتی آسودگی سے سروکار رکھتی تھی مگر اب حالات بدل چکے ہیں۔ گزشتہ ایک صدی میں پوری دنیا نے کئی عالمی اور مقامی لڑائیاں دیکھی ہیں، کئی سماجی، معاشی اور سیاسی تبدیلیوں کا سامنا کیا ہے اور نہ جانے کتنے نقوش بنتے بگڑتے دیکھے ہیں۔ ان سبھوں کا اس کی شخصیت اور تحریر پہ اثر بھی ہوا ہے۔ اس لیے کل کی عورت اگر اپنی مظلومیت پر روتی تھی، پریم چند کے یہاں ''کفن'' کی بدھیا تھی، شکیلہ اختر کے یہاں ''ڈائن'' تھی، بانو قدسیہ کے یہاں اپنے ہی سسر کے ساتھ جنسی رشتہ قائم کرنے اور تسنیم کوثر کے عہد تک ''بونسائی'' بنی رہنے پر مجبور وہ اب کسی جمشید کا ساغر نہیں ہے۔ اب وہ اپنی ہی نہیں دوسروں کی بھی حفاظت کا حوصلہ رکھتی ہے۔ اسے جہاں بنی بھی آتی ہے اور احتجاج کا سلیقہ بھی۔ اس لیے خواتین افسانہ نگاروں کی موجودہ نسل سے بہترین توقعات وابستہ ہیں۔

❒❖❒

Prof. Ejaz Ali Arshad
Nafis Colony, Bari Path
Patna- 800006 (Bihar)
Mob.: 9334107757

واثق الخیر

تبسم فاطمہ
کے افسانوں میں عورت کا باغیانہ تیور

تبسم فاطمہ کی پیدائش 3 جولائی 1967 میں صوبہ بہار کے آرا میں ہوئی اور ان کی وفات ان کے خاوند مشرف عالم ذوقی کے انتقال کے اگلے ہی دن 20 / اپریل 2021ء کو ہوئی۔ ایم اے تک کی تعلیم انھوں نے آرا میں رہ کر ہی حاصل کی۔ تبسم فاطمہ ہمہ جہت اور فعال شخصیت کی ملکہ تھیں۔ وہ افسانہ نگار کے علاوہ نقاد، صحافی، مترجم اور فلم ساز تھیں اور ساتھ ہی ساتھ عمدہ ذوق کی شاعرہ بھی تھیں۔ انھوں نے دوردرشن اور دوسرے ٹیلی ویژن چینل کے لیے کئی بڑے ادبی پروگرام بنائے ہیں اور پچاس سے زیادہ ادیبوں اور ان کی شخصیت پر ڈاکومینٹری بھی بنائی ہیں۔ بلونت سنگھ، سہیل عظیم آبادی، مشرف عالم ذوقی کے ناولوں پر سریل کے علاوہ کئی دستاویزی فلمیں اور ڈاکو ڈرامے بھی بنائیں۔ ریڈیو کے لیے بھی کئی سریز تیار کیں۔ بطور فری لانسر میڈیا کے لیے کام کرتی رہی تھیں۔ اردو اور ہندی دونوں میں لکھتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے افسانوں میں زبان و بیان کے ساتھ ساتھ تخلیقی گرفت بھی مضبوط ہے۔ آپ کے بیشتر افسانے عہد جدید کے ترجمان ہیں۔ اردو میں ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اپنے ادبی کارناموں پر دہلی اردو اکیڈمی اور بہار اردو اکیڈمی کی جانب سے ایوارڈ سے نوازی گئیں اور ہیومن رائٹس کا خصوصی ایوارڈ 2018 سے بھی سرفراز ہوئیں۔

تبسم فاطمہ نے 1984 سے لکھنا شروع کیا۔ ان کی پہلی کہانی 'ماہ رخ' رام پور سے شائع ہوئی۔ اب تک ان کے کئی افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا مجموعہ 'لیکن جزیرہ نہیں' 1995 میں شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ 'تاروں کی آخری منزل' 2012 میں منظر عام پر آیا۔ ان دو مجموعوں سے تیرہ افسانے کا انتخاب کر کے 'سیاہ لباس' کے نام سے ایک مجموعہ 2014 میں شائع ہوا۔ 'تاروں کی آخری منزل' ہر اعتبار سے بہتر اور اچھی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ افسانے کے موضوع میں نیا پن ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اسلوب میں بھی ہنرمندی اور قاری کو آسانی سے اپنی گرفت میں لینے کا ہنر موجود ہے۔ ان کے افسانے میں باغیانہ تیور خوب دکھائی دیتا ہے۔ تبسم فاطمہ اپنی کہانی کے ذریعہ سوئی ہوئی عورت کو بیدار کرنا چاہتی ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ عورت اپنے حق کے لیے لڑے اور نئی ایجادات کو نہ صرف اپنی زندگی میں شامل کرے بلکہ مرد سماج سے بھی آگے نکل جائے۔ اسی وجہ سے ان کے افسانوں میں عورت کے داخلی کرب، محبت، محرومی اور خواہشات کا مؤثر بیان ملتا ہے۔ افسانہ 'جرم'، 'سیاہ لباس'، 'تاروں کی آخری منزل'، 'حصار شب کا طلسم' اور 'ندامت' وغیرہ ان کے کامیاب افسانے ہیں۔ جس میں عورت سماج کی نمائندگی پرزور طریقے سے دکھائی دیتی ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ دور حاضر کی عورتیں آزاد ہیں وہ کسی بھی روایت، تحریک، نظریے یا ازم کے حصار میں قید نہیں رہنا چاہتی ہیں۔ ان کی سوچ بالکل آزاد ہے۔ آج کے

دور میں جہاں دنیا تیزی سے بدل رہی ہے تو عورتیں بھی پیچھے نہیں ہیں بلکہ مردوں کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل رہی ہیں۔ عورتیں آج کے موضوعات، مسائل، چیلینجز کو بڑی سنجیدگی سے اپنا رہی ہیں۔ وہ شاعری بھی کرتی تھیں۔ ’میں پناہ تلاش کرتی ہوں‘، ’ذرا دور چلنے کی حسرت رہی ہے‘، ’تمھارے خیال کی آخری دھوپ‘ ان کے شعری مجموعے ہیں۔ ہندی میں افسانوی مجموعہ ’جرم‘ (2018) میں شائع ہو چکا ہے۔ ایک طویل عرصے سے اردو کہانیوں کا ہندی ترجمہ اور ہندی کہانیوں کا اردو ترجمہ بھی کرتی رہیں تھیں۔ انھوں نے اردو سے ہندی میں بیس سے زیادہ کتابوں کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ تبسم فاطمہ چونکہ نظمیں لکھتی تھیں اس لیے انھیں نظموں کے ترجمے میں بھی خصوصی دلچسپی تھی۔ انھوں نے ادب سے کبھی بھی اپنا رشتہ منقطع نہیں کیا اور لکھتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا کہ ان کی شناخت الگ سے بنی رہے۔ وہ اپنی تحریر کے بارے میں لکھتی ہیں:

> ’’میں نے اچھی کہانیاں تو نہیں لکھیں لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ اپنے آس پاس کے ہونے والے واقعات سے میں نے کبھی آنکھیں بند نہیں رکھیں۔ واقعات، حادثات اور سماج میں اٹھنے بیٹھنے والے کردار کب کیسے میری کہانی کے کردار بن گئے کہہ نہیں سکتی۔‘‘ (لیکن جزیرہ نہیں)

تبسم فاطمہ نے اپنے افسانے سے تانیثی فکر کو نہ صرف فروغ دیا بلکہ نئی شکل میں اسے پیش بھی کیا۔ سماج میں ہونے والی زیادتیوں اور ناانصافیوں کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا۔ وہ عورت کو کمزور یا بزدل نہیں دیکھنا چاہتی تھیں۔ وہ روتی اور آنسو بہاتی ہوئی عورتوں کی جگہ حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے والی اور احتجاج کرنے والی عورت چاہتی تھیں۔ وہ سماج کی بیمار ذہنیت کو اپنے افسانے کا موضوع بناتی ہیں کیوں کہ انھوں نے دیکھ رکھا ہے کہ مرد سماج نے عورتوں پر قدغن لگا کر اس کی آزادی کو چھین رکھا ہے۔ اس لیے وہ کہتی ہیں کہ ’’میں بالکل نہیں مانتی کہ عورت بہت کمزور اور مجبور ہے۔ وہ ستائی ہوئی ہو سکتی ہے مگر ہاری ہوئی نہیں‘‘۔ اسی لیے تبسم فاطمہ افسانوں کے ذریعہ عورتوں کے اندر بڑی تبدیلی کی خواہش مند نظر آتی ہیں۔

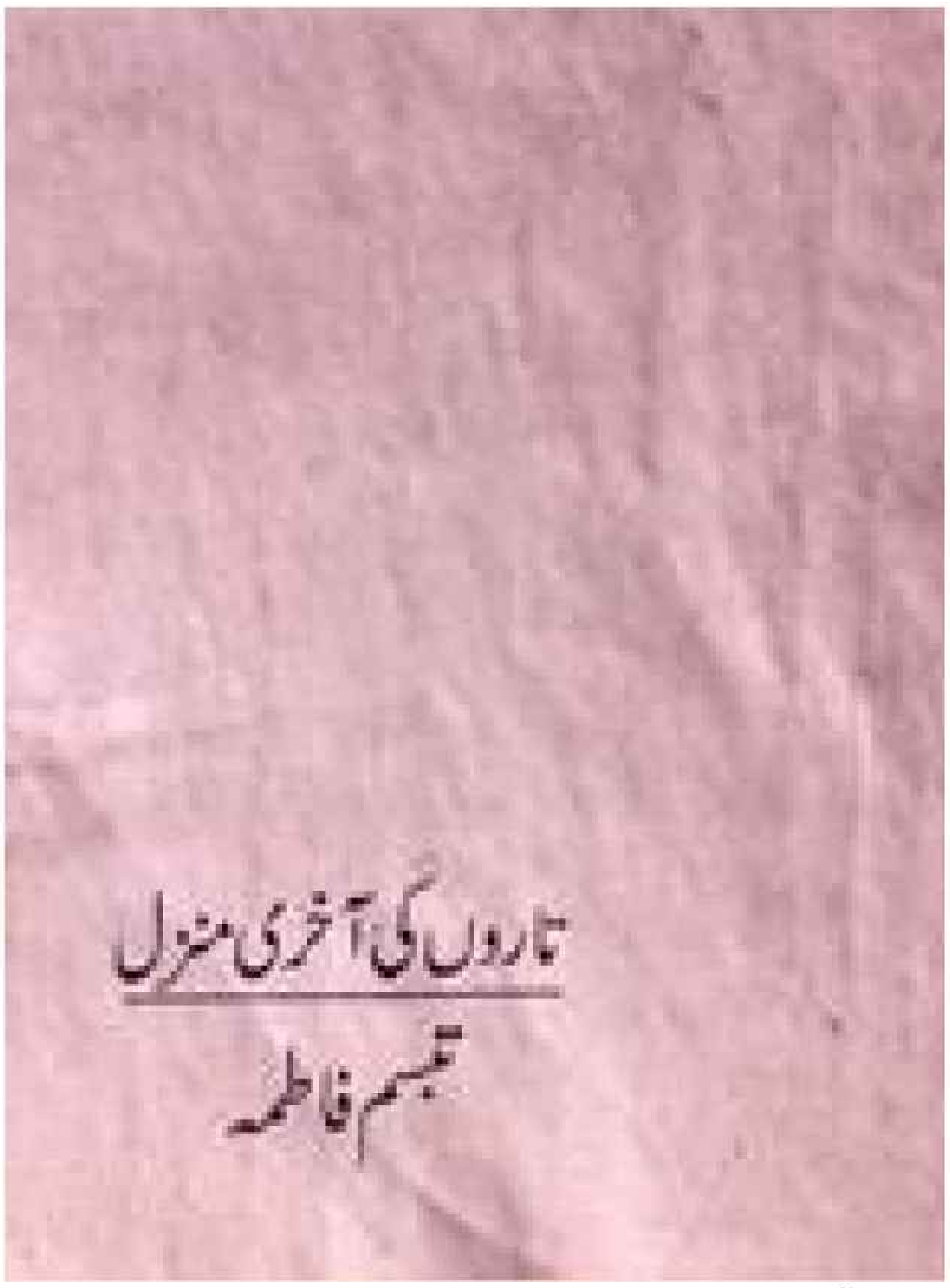

تبسم کے یہاں مرد سماج کے لیے جو غصہ اور احتجاج کی کیفیت نظر آتی ہے، وہ تانیثی ادب کے لیے نئی اور چونکانے والی حقیقت ہے۔ ان کے یہاں عورت کا بہت طاقتور تصور ملتا ہے، جو دبی کچلی ہونے کے باوجود بھی آخری دم تک لڑنے کا جذبہ رکھتی ہیں۔ جو پر امید ہیں اور زندگی جینا بھی چاہتی ہیں۔ ان کے افسانوں کی عورت مجبور اور لاچار نہیں بلکہ دلیر اور بہادر عورت ہے جو اپنی اہمیت کو سمجھ چکی ہے اور دوسروں کو سمجھانے کے لیے بغاوت پر اتر آتی ہے۔ تبسم فاطمہ اپنے اردگرد کی بے کس و مظلوم، استحصال زدہ اور نفسیاتی طور پر کچلی ہوئی عورتوں کو اپنی کہانیوں میں کسی نہ کسی طرح باغی بننے کی ترغیب دیتی ہیں۔ وہ یہ سمجھانا چاہتی ہیں کہ عورت کمزور اور مجبور نہیں۔ ان کے افسانے حقیقت اور احتجاج پر مبنی اور آس پاس کے ماحول سے متأثر نظر آتی ہیں۔ عورت کی آزادی اور سماجی برابری کا تصور ان کے افسانے کا نمایاں حصہ ہے۔ عورت ان کا سب سے پسندیدہ کردار ہے لیکن ان کی کہانی کی عورت عام ہونے کے باوجود بھی کہیں چنگاری، کہیں شعلہ اور کہیں انقلاب کے تصور کو ہوا دیتی نظر

آتی ہے۔ بغاوت کا ہر لہجہ اور احتجاج کی آواز تبسم فاطمہ کی تمام کہانیوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ کہانی 'لافنگ بدھا' کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''اس بار اس سے کوئی لاپرواہی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے ماتھر کی کمپنی چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اسے مجسمہ نہیں بننا تھا۔ اسے اب اپنے لیے بھی جینا تھا۔ ایک مدت سے وہ اپنی زندگی بھول چکی تھی۔ اب اس کو ایک نیا سفر شروع کرنا تھا۔ ابھی اس نئے سفر کے تمام اتار چڑھاؤ کے بارے میں غور کرنا تھا۔ گھر آنے کے بعد ایک خاص بات ہوئی۔ نیرج لافنگ بدھا کا ایک چھوٹا سا مجسمہ لے کر آیا تھا۔ مجسمہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے نیرج نے کہا۔

'اچھا ہے نا؟ اس گھر کو مسکراہٹ کی ضرورت ہے۔'

اس نے مجسمہ کو بے دردی سے زمین پر پٹخ دیا۔ مجسموں کی نہیں۔ مجھے زندگی کی ضرورت ہے۔''

(لافنگ بدھا)

ان کے افسانوں میں بغاوت کی جو چنگاریاں کوندتی نظر آتی ہے وہ سماج کے رویہ کے خلاف ابھرتی ہے عورت کا نیا باغی روپ بھی ان کے افسانوں کا خاصہ ہے یہ عورت نئی صدی کی شناخت کہی جاسکتی ہے۔ ان کے افسانوں کی خوبی یہ ہے کہ ان کے یہاں عورت کمزور نظر نہیں ہے بلکہ احتجاج کی ایک آواز بن کر ابھرتی ہے۔ ظاہری طور پر یہ احتجاج مرد سماج کے خلاف نظر آتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ عورت کے اندر جو ڈر اور خوف ہے اسے ختم کرنا چاہتی ہیں۔ تبسم فاطمہ چاہتی ہیں کہ عورت مرد سماج میں دوسرے درجہ کی حیثیت سے نہ رہے بلکہ وہ خود دار، خود اعتماد اور باعزت اور بے خوف ہوکر زندگی گزارے۔ ان کے افسانوں کے موضوعات کے سلسلے میں یہ اقتباس دیکھیے:

''تبسم فاطمہ کے یہاں زندگی کی چھوٹی چھوٹی حقیقتوں کو اس کے پورے حسن و قبح کے ساتھ گرفت کرنے کی سعی نظر آتی ہے۔ انھوں نے اپنے اردگرد کی بے کس و مظلوم، استحصال زدہ اور نفسیاتی طور پر کچلی ہوئی عورتوں کو اپنی کہانیوں میں کسی نہ کسی طرح باغی بننے کی ترغیب دی ہے۔''

(لیکن جزیرہ نہیں)

تبسم فاطمہ مظلوم، مجبور اور نفسیاتی طور پر دبی کچلی عورتوں کو ان کا حق دلانے کی بھرپور کوشش کرتی نظر آتی ہیں۔ لڑکیوں کے حقوق کے سلسلے میں آپ کا تحریر کردہ افسانہ 'بند راستوں کی ایک منزل' کافی اہمیت رکھتا ہے۔ اس افسانے کی نسوانی کردار 'شبو' کی زبانی انھوں نے اپنے نظریات کی پیشکش کی ہے۔ وہ لڑکیوں کو بندھے ٹکے اصولوں کے زیر اثر زندگی گزارنے کی قائل نہیں ہیں۔ آزاد فضاؤں اور آزاد فیصلے کے ساتھ تبسم فاطمہ لڑکیوں کو جینے کی دعوت دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس افسانے کا ایک ایک حرف فرسودہ رسم و رواج کے خلاف صدائیں بلند کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ شبو کی پرورش میں اس کے والد نے کسی طرح کی کمی نہیں رکھی ہے۔ وہ اسے تمام طرح کی آزادی دینا چاہتے ہیں جس کی وہ حقدار ہے۔ وہ اسے آزاد فضا میں سانس لیتے ہوئے زندگی کے اہم فیصلے خود کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں افسانے کا یہ اقتباس دیکھیے:

''شبو!......اپنے فیصلے خود لینا بیٹا......جو مضبوط ہوتے ہیں وہ اپنے فیصلے خود لیتے ہیں...... کمزور ہوگی تو جینا مشکل ہوجائے گا۔ زمین تنگ ہوجائے گی...... کبھی ڈرنا مت......'' (افسانہ، بند راستوں کی ایک منزل)

تبسم فاطمہ مزاجاً مضبوط اور بولڈ تھیں اور اپنے افسانوں میں بھی اپنی بولڈنس کا ثبوت فراہم کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ افسانہ 'صحرا میں نہیں رہنا' میں اسی سوچ کی عکاسی ملتی ہے۔ افسانے کی عورت کردار کے ذریعہ تبسم فاطمہ عورت کی فکری اساس کو سامنے لاتی ہیں۔

''یہ کیسی آزادی ہے کہ ساری زندگی ایک چہار دیواری کے اندر ایک ایسے آدمی کے ساتھ بسر کی جائے جس سے نہ خیال ملتے ہوں۔ نہ معیار اور وہ ہر وقت ساتھ میں پنجرہ لیے گھومتا رہتا ہو......زیادہ اڑان مت بھرو پنجرے میں آجاؤ۔ یہ ٹی۔ وی دیکھنے کا وقت نہیں ہے۔ میرے دوست آنے والے ہیں

چلو پنجرہ سنبھالو۔تم جاب کروگی ؟نہیں تم پنجرے میں زیادہ اچھی معلوم ہوتی ہو۔‘‘(افسانہ،صحرا میں نہیں رہنا)

درج بالا اقتباس میں تبسم فاطمہ نے وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو آج کی عورت کا درد ہے۔ایک لڑکی اپنا سب کچھ چھوڑ کرایک اجنبی گھر اور اجنبی لوگوں کے درمیان شادی کر کے آتی ہے اور اسے سسرال میں آکر کیا ملتاہے۔شوہر سے خیال ملتے ہوں یا نہ ہوں۔ اس کے معیار پر پورا اترتا ہو یا نہ ہولیکن اس کے ساتھ زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ نہ عورت کے جذبات کی اسے فکر ہوتی ہے نہ اس کے خیالات کی۔ وہ عورت کو زرخرید غلام سمجھتا ہے اور ہر وقت ایک پنجرہ لے کر گھومتا رہتا ہے۔ بیوی ذرا سا بھی اڑنے کی کوشش کرتی ہے تو شوہر پنجرہ لے کر سامنے آجاتا ہے۔ اگرعورت نوکری کرنا چاہے تو اسے روک دیا جاتا ہے۔سوالات کھڑے کردیئے جاتے ہیں کہ گھر والوں کی خدمت کون کرے گا۔کھانا کون بنا کر دے گا۔سب کا خیال کون رکھے گا۔ جب کہ عورت سب کا خیال رکھتی ہے مگر اس کا خیال کوئی نہیں رکھتا۔ وہ کولھو کے بیل کی طرح جتی رہتی ہے۔ وہ اپنی مرضی سے کوئی کام نہیں کرسکتی۔ آگے کی تعلیم جاری رکھنے کے لیے شوہر اور ساس سسر کی اجازت لینا ضروری ہے۔نوکری کرنے کے لیے سسرال والوں کی رضامندی ضروری ہے، گھر سے کہیں باہر جانا ہے تو بغیر اجازت کے نہیں جاسکتی۔کتنی عورتیں ہیں جو اپنی مرضی سے زندگی جیتی ہیں اور اگر احتجاج کیا تو کہہ دیا جاتا ہے کہ گھر کا دروازہ کھلا ہے، جاسکتی ہو۔لیکن اس افسانہ کا عورت کردار آزاد زندگی گزارنا چاہتی ہے۔ افسانے کا ایک اقتباس دیکھیے جب لڑکی کی شادی طے ہونے لگی تو اس نے کہا۔

’’جہاں مرضی کر دیجیے۔ وہ میرے ساتھ جی سکے گا تو یہ اس کی خوش نصیبی ہوگی۔ اماں میرے ان تیوروں سے واقف تھیں۔ وہ اکثر میری باتوں پر خاموش رہنا ہی پسند کرتی تھیں۔ ویسے بھی وہ خاموش طبیعت واقع ہوئی تھیں۔ میں ایک این۔جی۔او سے وابستہ تھی اور کاشف بینک میں اعلیٰ عہدے پر تھے۔ کچھ ہی دن میں وہ میرے مزاج سے واقف ہوگئے جبکہ شروعات میں انھوں نے دباؤ بنانے کی کوشش کی تھی لیکن جلد ہی کاشف کو اس بات کا احساس ہوگیا کہ یہ لڑکی ٹیڑھی کھیر ہے اور بہتر ہے کہ بھڑ کے چھتے میں ہاتھ نہ ڈالا جائے۔‘‘

(افسانہ،صحرا میں نہیں رہنا)

یہ ایک باغی لڑکی کا افسانہ ہے جو اپنے طور پر زندگی گزارنا چاہتی ہے۔ وہ اپنی آزادی کے لیے کبھی ہارمونیم بجاتی ہے تو کبھی کتابوں کا سہارا لیتی ہے جبکہ اس کا شوہر نہ شوخی پسند تھا اور نہ رومانی تھا، نہ اسے موسیقی پسند تھی لیکن کاشف کے اندر ایک تبدیلی آتی ہے وہ اس کے ہارمونیم بجانے پر ایک دن کہتا ہے’’تم واقعی ہارمونیم اچھا بجالیتی ہو۔‘‘ پھر وہ کتاب اٹھا کر پوچھتا ہے۔ یہ تو قرۃ العین حیدر کا ناول ’چاندنی بیگم‘ ہے۔ میں نے ان کا نام سنا ہے۔ممکن ہے کاشف اپنی بیوی کی آزادی سے گھبرا کر اس کا ساتھ دے رہا ہو۔

تبسم فاطمہ عورت کو اسی روپ میں دیکھنا چاہتی ہیں لیکن افسانہ ’سیاہ لباس‘ کی ماں آزاد خیال ہوتے ہوئے بھی جوان ہوتی بیٹی کے لیے فکر مند ہے۔ بیٹی جس طرح روز ہونے والے واقعات و حادثات کو ماں سے شیئر کرتی ہے ماں ڈر جاتی ہے لیکن بیٹی نظر انداز کر دیتی ہے کہ نئے زمانے میں یہ تو روز کا معمول ہے لیکن جب کالج کا بوڑھا پروفیسر اور دوسرے بوڑھے لوگوں کی نگاہیں اسے اپنے جسم میں اندر تک چبھتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں تو وہ کہتی ہے۔

’’نہیں..... صحیفہ زور سے چیخی۔ لڑکوں سے ڈر نہیں لگتا بوڑھوں سے ڈر لگتا ہے...... وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کہہ رہی تھی......سڑک پر باتیں کرتے ہوئے شاپنگ کرتے ہوئے کہیں بھی چلے جاؤ..... بوڑھی نظریں ایسے گھور رہی ہوتی ہیں جیسے کبھی لڑکی دیکھی ہی نہ ہو......جیسے یہ نظریں جوان گوشت میں سما جائیں.....کیوں ہو گئے ہیں سب لوگ ایسے۔ کیوں سمجھتے ہیں کہ لڑکیاں محض گوشت کی دکان ہیں ان کے لیے۔ صحیفہ زور سے چیخی..... وہ کالج کا بڈھا پروفیسر..... میں اسے کئی دنوں سے دیکھ رہی ہوں.....مگر

اب.....صحیفہ کی سانسیں الجھ گئی تھیں.....گھر سے باہر نکلو تو جیسے.....جسم پر ہزار چبھتی ہوئی آنکھیں ہوتی ہیں۔''

(افسانہ، سیاہ لباس)

مذکورہ افسانے میں ایک الگ طرح کی ہی بغاوت دکھائی دیتی ہے جس میں عورت خود کمزور پڑتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے۔ صحیفہ نہ کالج چھوڑتی ہے اور نہ راستے پر چلنا بلکہ ایسے لوگوں سے بچنے کے لیے نقاب لگا کر باہر نکلتی ہے۔ اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا پردہ کرنا مسئلے کا حل ہے۔ تبسم فاطمہ مرد سماج کو اپنی سوچ میں تبدیلی لانے کی پرزور اپیل کرتی ہیں تا کہ کسی لڑکی کو نقاب لگا کر گھر سے نکلنے کی ضرورت نہ ہو۔ افسانہ 'حجاب' میں چودہ سال کے ایک بیٹے کو ماں کے نیٹ پر چیٹ کرنے سے اعتراض ہے۔

''کیا کر رہی تھی اماں۔؟''

یکا یک اس کے سوال سے چونک پڑی میں..... ''کچھ نہیں۔''

''چیٹ۔ کر رہی تھی؟''

''ہاں کہتے ہوئے اس کی طرف مڑی..... اماں چیٹ نہیں کر سکتی کیا؟''

''کیوں نہیں......کوئی دوست؟''

''اماں کے چیٹ فرینڈ نہیں ہو سکتے کیا؟''

''کیوں نہیں.....''

(افسانہ، حجاب)

ایک ماں بیٹے کے درمیان کا مکالمہ بیٹے کی ذہنیت کو واضح کرتا ہے۔ ماں جو وقت گزاری کے لیے نیٹ سے جڑی ہے لیکن بیٹے کو یہ قطعی پسند نہیں کہ ماں کے فرینڈ ہوں اور وہ چیٹ کرے۔ جبکہ اس کے شوہر کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔

''حجاب'' ایک باغی عورت پر مبنی افسانہ ہے جب زرینہ بڑی ہو رہی تھی اور ماں اسے حجاب پہننے کے لیے کہتی ہے تو وہ صاف منع کر دیتی ہے کہ وہ حجاب نہیں پہنے گی۔ زرینہ بچپن میں محلے کی گلی میں بچوں کے ساتھ کنچے اور کبڈی کھیلتی تھی۔ بندر کا تماشہ دیکھتی تھی لیکن اس کے جوان ہوتے ہی تمام چیزوں پر پابندی لگادی گئی۔ زرینہ کا سوال اپنی جگہ قائم تھا کہ بھائیوں کو ساری آزادی اور مجھے قید کیوں؟ وہ جہاں چاہے جا سکتے ہیں۔ جس سے چاہیں مل سکتے ہیں مگر میں ایسا کیوں نہیں کر سکتی؟ اسے کیوں حجاب پہنانے کے لیے گھر کے لوگ بضد ہیں۔ زرینہ بغاوت کرتی ہے۔ پھر اس کی شادی ہو جاتی ہے اور اس کا بیٹا عظمیٰ دھیرے دھیرے پروان چڑھتا ہے اور آج چودہ سال کا بیٹا ماں سے انٹرنیٹ پر چیٹ کرنے پر سوال کرتا ہے۔ دراصل عظمیٰ بیٹا کی شکل میں مردانہ سماج کا نمائندہ بن جاتا ہے۔ زرینہ کے والد کل جو چھوٹی بڑی باتوں پر اسے ٹوکتے رہتے تھے آج زرینہ کا بیٹا ماں کے چیٹ کرنے پر سوال کر رہا ہے۔ عورت باپ، شوہر اور بیٹے کی بندشوں میں گھری رہتی ہے۔ یعنی زمانہ اتنی ترقی کرنے کے بعد بھی عورت کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی روپ میں مردانہ سماج کے بندھن سے نہیں نکل سکی ہے۔ بغاوت کرنے والی زرینہ آج ایک بار پھر اسی سوال کے گھیرے میں ہے۔

''میں واپس اس جگہ کو دیکھتی ہوں جہاں کچھ دیر پہلے عظمیٰ موجود تھا۔ اب وہاں کوئی نہیں ہے.....لیکن اس کے لفظ مجھے ڈرا رہے ہیں......اندر ایک ہلچل سی ہے۔ سائن آوٹ کرتی ہوئی میں خاموشی سے ٹھہر جاتی ہوں۔ ایسا لگا جیسے برسوں بعد ایک بار پھر میرے بیٹے نے مجھے حجاب پہنا دیا ہو۔''

(افسانہ، حجاب)

عورت چاہے جتنی بھی ترقی پسند ہو کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی شکل میں اس کے وجود پر حملہ ہوتا رہتا ہے۔ کبھی باپ، کبھی شوہر اور کبھی بیٹا یعنی عورت گھوم پھر کر اسی محور پر رقص کرتی رہتی ہے جیسا صدیوں سے کرتی آ رہی ہے۔

افسانہ ''جرم'' میں شوہر اور بیوی کی کہانی ہے۔ اس میں عورت کی نفسیات کو بیان کیا گیا ہے کیسے وقت کے ساتھ ساتھ رشتے دھندلے پڑ جاتے ہیں۔ منیش اور دیپا نے محبت کی شادی کی ہے۔ منیش ڈرپوک قسم کا شخص ہے جبکہ دیپا بے حد بولڈ عورت ہے۔ کل تک جو بیوی بہت خوبصورت اور مکمل لگتی تھی، اس میں کیسے تبدیلی

آجاتی ہے، کیسے اس کا شوہر اس کے بے ڈھب بدن کو بار بار ٹوکتا ہے کہ تم کتنی بڑھی دکھنے لگی ہو۔ دیپا سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ کیا یہی پیار تھا۔ یہی احساس عورت کے اندر کے باغیانہ تیور کو ابھارنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ دیپا سوچتی ہے کہ کیا یہ بھی تمام مردوں کی طرح صرف جسم سے محبت کرتا ہے۔

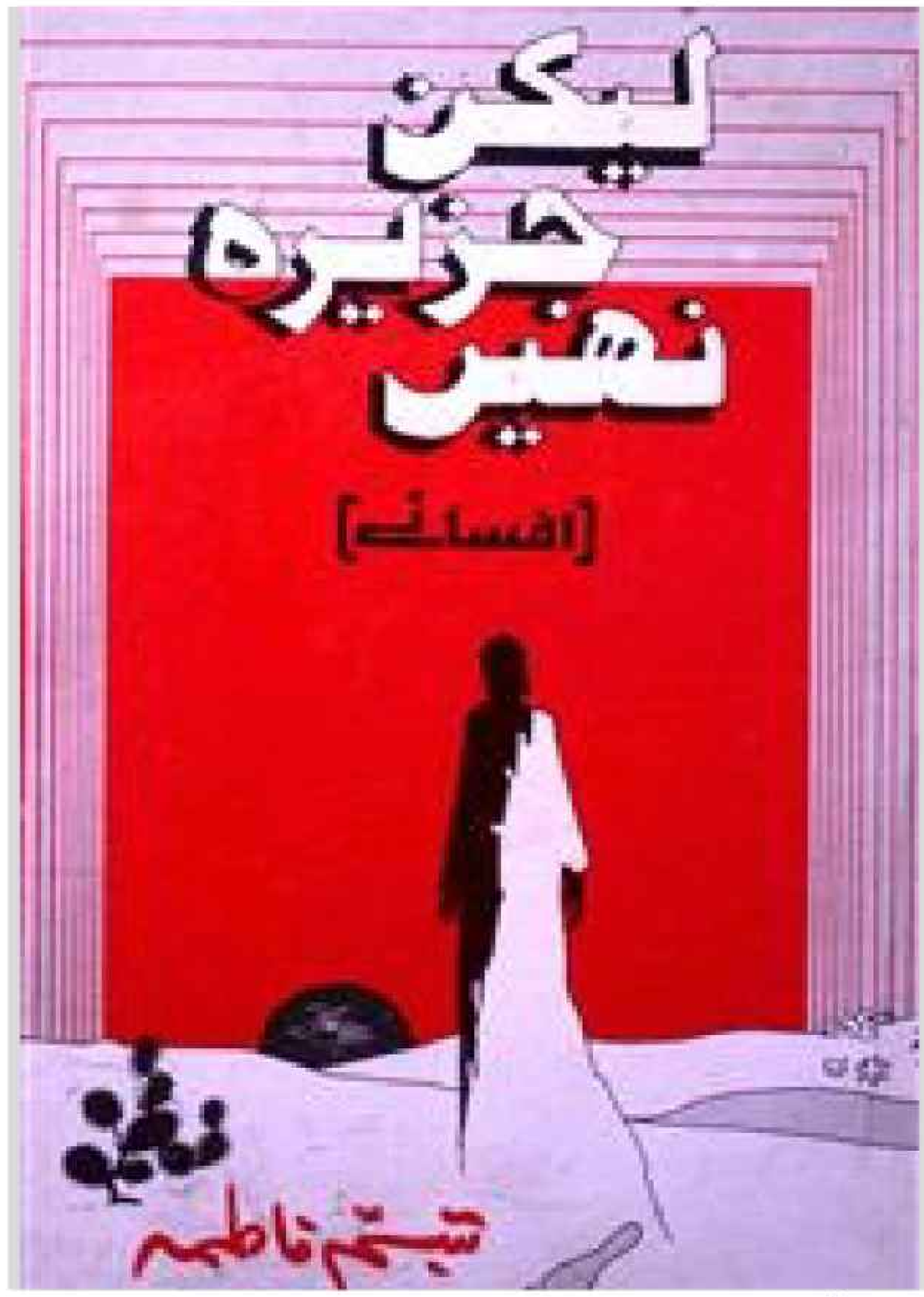

تبسم فاطمہ کے بیشتر افسانوں میں انقلاب اور احتجاج کی جو فضا ملتی ہے وہ اردو افسانوں کے لیے نئی ہے۔ عام قاری بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ آخر کیوں عورت کبھی ماں، بیٹی، بہن اور بیوی بن کر قربانی دے؟ کیوں وہ آزاد نہیں؟ کیوں وہ گھوم نہیں سکتی؟ پڑھ نہیں سکتی؟ اپنی مرضی کے کپڑے نہیں پہن سکتی؟ اپنی مرضی سے شادی نہیں کر سکتی؟ کیوں وہ عمر کے ہر پڑاؤ پر گھٹ گھٹ کر جیئے؟ کیوں وہ مرد کے برابر نہیں؟ کیوں اس کے اپنے اسے بغاوت کرنے پر مجبور کرتے ہیں؟ اس طرح کے ہزاروں سوال ان کی کہانیوں کے مطالعہ سے قاری کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ حقیقت میں عورتوں کے سماج میں گھٹن اور قید کا احساس آج بھی ہے لیکن اسی کے ساتھ بغاوت کا جذبہ بھی پیدا ہو رہا ہے۔ تبسم کی کہانیاں اسی بغاوت کے جذبہ سے سر اٹھاتی ہیں۔ ان کے افسانے میں عورت سراپا احتجاج ہے۔ کبھی یہ عورت اپنے باپ سے احتجاج کرتی ہے تو کبھی اپنے شوہر سے، کبھی سماج سے اور کبھی اپنے ہی بیٹے سے۔ تبسم فاطمہ کی عورت روز مرد سماج سے ٹکراتی ہے اور انقلاب کا جھنڈا بلند کرتی ہوئی نظر آتی ہے اور قاری کے لیے نئے سوال چھوڑ جاتی ہیں کہ عورت صرف مظلوم بن کر رہے یا پھر مرد سماج سے مقابلہ کرتے ہوئے کندھے سے کندھا ملا کے چلے۔ ان کی ہر کہانی ایک سوال چھوڑ جاتی ہے کہ عورت مظلوم اور مجبور رہے گی۔ عورت مردوں کے شانہ بہ شانہ کیوں کھڑی نہیں ہو سکتی۔ وہ اپنے تمام افسانوں میں اسی بات کو اٹھاتی ہیں اور مظلوم و مجبور سماج کی نمائندگی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

تبسم فاطمہ کے افسانوں میں زبان و بیان بھی صاف اور سلیس ہے۔ ان کی زبان عام فہم اور سادہ ہے لیکن اس سادگی میں ایک خاص کشش اور تاثیر موجود ہے۔ وہ مشکل الفاظ سے گریز کرتی ہیں اور روزمرہ کے محاوراتی انداز کو اپناتی ہیں۔ ان کی تحریریں نہ صرف فکری گہرائی رکھتی ہیں بلکہ اسلوبیاتی سطح پر بھی خاصی پختہ اور پر اثر ہوتی ہیں۔ ان کے افسانوی میں زبان و بیان کے ساتھ ساتھ تخلیقی گرفت بھی مضبوط ہے۔ تبسم فاطمہ علامتوں اور استعاروں کا خوبصورت استعمال بھی کرتی ہیں، جس کی وجہ سے افسانے میں جذبات اور خیالات کو گہرائی ملتی ہے۔ پلاٹ، کردار، مکالمے، منظر نگاری اور اختتام سبھی کچھ روایتی انداز میں ہوتا ہے مگر انداز بیان دوسروں سے مختلف ہوتا ہے جس کے باعث ان کے افسانوں میں قاری کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔

❐❖❐

Dr. Wasiqul Khair
Head, Department of Urdu
B. N. College
Tilka Manjhi Bhagalpur University
Bhagalpur, Bihar, 812007
Email: wasujnu@gmail.com

راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں میں خواتین کے مسائل

محمد شاداب شمیم

راجندر سنگھ بیدی اردو ادب کے ان ممتاز افسانہ نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں جنھوں نے اپنے فنی شعور، نفسیاتی بصیرت اور سماجی آگہی کے ذریعے فکشن نگاری کو نئے نکات عطا کیے۔ بیدی نے اپنے افسانوں میں انسان کے داخلی اور خارجی مسائل کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ان کے کردار محض فرضی محسوس نہیں ہوتے بلکہ حقیقی زندگی کے جیتے جاگتے انسان دکھائی دیتے ہیں۔ بیدی کی شخصیت اور فن میں ایک خاص کشش پائی جاتی ہے۔ وہ زندگی کے مختلف رنگوں اور سماجی مسائل کو بہت قریب سے دیکھنے والے ادیب تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں معاشرتی حقیقت نگاری نفسیاتی تجزیہ کاری اور ساتھ ساتھ ملتی ہیں۔ انھوں نے نہ صرف سماج کے ظاہری پہلوؤں کو موضوع بنایا بلکہ انسانی نفسیات کے ان گوشوں کو بھی روشن کیا جن پر عام طور پر کم توجہ دی جاتی ہے۔

راجندر سنگھ بیدی کی ادبی دلچسپی کا آغاز بچپن ہی سے ہو گیا تھا۔ ان کی والدہ انھیں کہانیاں سنایا کرتی تھیں جنھوں نے ان کے ذہن اور تخیل پر گہرا اثر ڈالا۔ یہی قصے اور کہانیاں ان کے اندر تخلیقی رجحان پیدا کرنے کا سبب بنیں۔ جیسے جیسے عمر میں اضافہ ہوا، ان کا رجحان فکشن کی طرف مضبوط ہوتا گیا۔ تعلیم اور ملازمت کے زمانے میں بھی وہ مسلسل ادبی سرگرمیوں سے وابستہ رہے۔ معاشی مشکلات اور گھریلو مسائل کے باوجود ان کے ادبی سفر میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو سکی۔

بیدی نے افسانوں کے ساتھ ساتھ ناول، ڈرامے اور مضامین بھی تحریر کیے۔ ان کے اہم افسانوی مجموعوں میں گرہن، کوکھ جلی، اپنے دکھ مجھے دے دو، ہاتھ ہمارے ہوئے، مکتی بودھ، گرم کوٹ، لمبی لڑکی، مہمان اور کندن شامل ہیں۔ ان کا مشہور ناول ایک چادر میلی سی اردو ادب کا ایک اہم سرمایہ تصور کیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ حجم کے اعتبار سے مختصر ہے لیکن فنی لحاظ سے اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اس ناول کا کئی زبانوں میں ترجمہ بھی کیا گیا اور بعد میں اس پر فلم بھی بنائی گئی۔ راجندر سنگھ بیدی کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، غالب ایوارڈ، فلم فیئر ایوارڈ اور پدم شری جیسے بڑے اعزازات سے نوازا گیا۔ یہ ان کی ادبی عظمت اور تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف تھا۔

بیدی کے افسانوں کی اہمیت اس بات میں پوشیدہ ہے کہ وہ وقت گزرنے کے باوجود اپنی تازگی برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی تخلیقات آج بھی اسی طرح قاری کو متاثر کرتی ہیں جس طرح اپنے دور میں کرتی تھیں۔ ان کے افسانوں میں انسانی زندگی کے مسائل، سماجی تضادات اور نفسیاتی پیچیدگیاں نہایت فنی انداز میں پیش کی گئی ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی اردو افسانے کے ان نمایاں تخلیق کاروں میں شامل ہیں جنھوں نے افسانہ نگاری کو فنی اور فکری اعتبار سے نئی جہتیں عطا کیں۔ اگرچہ انھوں نے اپنے بعض ہم عصروں کے

مقابلے میں نسبتاً کم افسانے لکھے، لیکن ان کی تحریروں کا معیار ہمیشہ بلند رہا۔ ان کے افسانے محض واقعات کی ترتیب یا قصہ گوئی تک محدود نہیں رہتے بلکہ انسانی زندگی کے پیچیدہ مسائل، جذبات اور نفسیاتی کیفیتوں کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔ ان کے فن کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ زندگی کے تلخ حقائق کو بڑی مہارت اور فنی نزاکت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

بیدی کے افسانوں میں حقیقت نگاری نمایاں طور پر موجود ہے۔ انھوں نے اپنے گردوپیش کے ماحول، سماجی رویوں اور انسانی زندگی کے مختلف تجربات کو نہایت باریک بینی سے دیکھا اور پھر انھیں اپنے تخلیقی شعور کا حصہ بنایا۔ ان کے افسانوی اسلوب کا ایک اہم پہلو نفسیاتی تجزیہ ہے۔ انھوں نے انسانی ذہن کے داخلی احساسات، خواہشات، خوف، محرومی اور جذباتی کشمکش کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کردار محض سطحی کردار نہیں ہوتے بلکہ ان کی ایک داخلی دنیا بھی ہوتی ہے۔ بیدی کرداروں کے ذہنی اور جذباتی حالات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ قاری ان کے احساسات سے خود کو وابستہ محسوس کرنے لگتا ہے۔

بیدی کے افسانوں کی ایک اہم خوبی ان کی کردار نگاری ہے۔ انھوں نے اپنے کرداروں کی تخلیق میں غیر معمولی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ ان کے کردار عام زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور اپنے ماحول کی نمائندگی کرتے ہیں۔ وہ نہ تو غیر حقیقی معلوم ہوتے ہیں اور نہ ہی ان میں مصنوعی پن پایا جاتا ہے۔ ان کے کردار مختلف طبقوں اور مختلف سماجی پس منظر سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں مرد، عورت، نوجوان، بوڑھے، مزدور، ملازم، غریب اور امیر سبھی شامل ہیں۔ ان کے تخلیق کردہ کئی کردار اردو ادب میں مستقل حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ مثال کے طور پر لاجونتی، اندو اور رانو جیسے کردار اردو ادب کے یادگار کرداروں میں شامل ہو گئے ہیں۔ بیدی نے اپنے کرداروں کو صرف ظاہری خصوصیات تک محدود نہیں رکھا بلکہ ان کی داخلی کیفیتوں اور نفسیاتی پہلوؤں کو بھی نمایاں کیا ہے۔

بیدی کے افسانوں میں پلاٹ کی تعمیر بھی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ وہ افسانوں کے پلاٹ کی تشکیل بہت احتیاط اور مہارت کے ساتھ کرتے ہیں۔ ان کے یہاں واقعات ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں اور کہانی میں کہیں غیر ضروری پیچیدگی یا بے ترتیبی محسوس نہیں ہوتی۔ ان کا ہر واقعہ کہانی کی پیش رفت میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں ابتدا سے اختتام تک دلچسپی برقرار رہتی ہے۔

ان کے اسلوب کا ایک اہم پہلو علامتوں، تشبیہوں اور استعاروں کا استعمال بھی ہے۔ بیدی نے اپنے افسانوں میں ادبی صنعتوں کو نہایت فنی انداز میں استعمال کیا ہے۔ وہ ان علامتی اور استعاراتی پیرایوں کے ذریعے سماجی مسائل، تہذیبی اقدار اور انسانی رویوں کو زیادہ مؤثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کا افسانہ 'گرہن' اس کی ایک عمدہ مثال ہے، جہاں علامتی انداز میں مختلف سماجی حقیقتوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ بیدی کی زبان بھی ان کی انفرادیت کا اہم عنصر ہے۔ ان کی زبان میں ہندی اور پنجابی الفاظ کا بھی مناسب استعمال ملتا ہے، جس سے ان کی تحریروں میں ایک خاص فطری رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ چونکہ ان کا تعلق پنجاب سے تھا، اس لیے پنجابی تہذیب اور زبان کے اثرات ان کی تخلیقات میں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

بیدی کے افسانوں میں ہندوستانی تہذیب اور ثقافت کی جھلک بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ انھوں نے معاشرتی رسوم و رواج، خاندانی نظام اور تہذیبی اقدار کو اپنے افسانوں کا حصہ بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں مقامی رنگ اور معاشرتی فضا بڑی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ موضوعات کے اعتبار سے بھی بیدی کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ انھوں نے انسانی زندگی کے مختلف مسائل کو اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ غربت، طبقاتی فرق، سماجی ناانصافی، عورتوں کے مسائل، محبت، نفسیاتی کشمکش اور خاندانی مسائل ان کے اہم موضوعات ہیں۔ گویا بیدی مقامیت سے کلی طور پر جڑے رہے ہیں۔ تاہم عورتوں کے مسائل اور ان کی نفسیاتی الجھنوں کو انھوں نے جس وسعت اور گہرائی کے ساتھ پیش کیا، وہ ان کے فن کی ایک منفرد

خصوصیت ہے۔ اس نقطے پر پہنچ کر بیدی آدھی دنیا یعنی نسائی حسیت کے ترجمان نہیں بلکہ مصور کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔

راجندر سنگھ بیدی نے اپنے افسانوں میں انسانی زندگی کے مختلف مسائل کو موضوع بنایا ہے، لیکن عورتوں سے متعلق مسائل کو خاص اہمیت دی ہے۔ ان کے افسانوں کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عورت کی زندگی، اس کی محرومیوں، نفسیاتی الجھنوں اور معاشرتی مشکلات سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ انھوں نے عورت کے دکھ درد کو محض ایک سماجی مسئلہ سمجھ کر بیان نہیں کیا بلکہ اس کے احساسات اور داخلی کیفیات کو بھی پوری شدت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

بیدی کے نسوانی کردار عام زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ نہ تو غیر معمولی کردار ہیں اور نہ ہی تصوراتی دنیا کی مخلوق، بلکہ وہ حقیقی معاشرتی زندگی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں عورت کبھی ماں، کبھی بیوی، کبھی بہو اور کبھی بیٹی کی صورت میں سامنے آتی ہے اور ہر کردار اپنی الگ شناخت اور پہچان رکھتا ہے۔ بیدی نے خاص طور پر عورت کے بحیثیت بیوی اور بہو مسائل کو نمایاں انداز میں پیش کیا ہے۔ مشرقی معاشرے میں شادی کے بعد عورت کی ذمے داری بڑھ جاتی ہے۔ اکثر اوقات اسے گھر کے تمام کام سنبھالنے پڑتے ہیں اور اس کے باوجود اسے عزت اور محبت نہیں ملتی۔ کئی مرتبہ سسرال کے افراد کی طرف سے اسے منفی رویوں اور طعنوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

افسانہ 'گرہن' میں بیدی نے عورت کی اسی صورتِ حال کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ اس افسانے میں عورت گھریلو دباؤ، زیادتی اور ذہنی اذیت کا شکار نظر آتی ہے۔ اسے صرف جسمانی مشقت ہی برداشت نہیں کرنی پڑتی بلکہ جذباتی سطح پر بھی تکلیف سے گزرنا پڑتا ہے۔ بیدی نے اس افسانے میں اس امر کی نشان دہی کی ہے کہ بعض گھروں میں عورت کی حیثیت ایک فرد کے بجائے صرف خدمت انجام دینے والی شخصیت تک محدود ہو جاتی ہے۔ اسی طرح بیدی نے عورت کی زندگی میں اولاد اور حمل کے مسئلے کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ ہمارے معاشرے میں بعض اوقات عورت کی صحت اور جسمانی کیفیت کو نظر انداز کرتے ہوئے اس پر زیادہ بچوں کی ذمے داری ڈال دی جاتی ہے۔ مسلسل حمل اور بچوں کی پیدائش عورت کی جسمانی اور ذہنی صحت پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہے۔ بیدی نے اس مسئلے کو محض خاندانی مسئلہ نہیں سمجھا بلکہ اسے عورت کے بنیادی حقوق سے جوڑا ہے۔

عورتوں کے مسائل میں جہیز بھی ایک نہایت اہم مسئلہ رہا ہے، جس نے بے شمار خاندانوں کی زندگیوں کو متاثر کیا ہے۔ جہیز کی وجہ سے کئی لڑکیوں کی شادیاں نہیں ہو پاتیں اور بعض اوقات شادی کے بعد بھی انھیں ذہنی اور جسمانی اذیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بیدی نے اپنے افسانہ 'ایوالانش' میں اس مسئلے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ کس طرح ناپسندیدہ اور مضر معاشرتی رسم و رواج انسانیت پر غالب آجاتے ہیں جن سے عورت کی زندگی مشکلات سے بھر جاتی ہے۔ اسی طرح شادی اور رشتوں کے مسائل بھی عورت کی زندگی کا ایک اہم حصہ ہیں۔ ہمارے معاشرے میں اکثر لڑکیوں کی ظاہری شکل وصورت، قد، رنگ یا معاشی حیثیت کو بنیاد بنا کر ان کے رشتوں کے فیصلے کیے جاتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں لڑکیوں کو احساسِ محرومی اور ذہنی دباؤ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بیدی نے افسانہ 'لمبی لڑکی' میں اس مسئلے کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے سماج کی اس ذہنیت کو بے نقاب کیا ہے جو انسان کی اصل خوبیوں کے بجائے ظاہری چیزوں کو زیادہ اہمیت دیتی ہے۔

غربت بھی عورت کے مسائل میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ غریب عورت کو زندگی کی بنیادی ضروریات کے حصول کے لیے مسلسل جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ معاشی تنگی اس کی زندگی کو مزید دشوار بنا دیتی ہے۔ بیدی نے اپنے افسانہ 'پان شاپ' میں غربت کے اثرات اور اس کے نتیجے میں عورت کی مشکلات کو بڑی حقیقت پسندی کے ساتھ بیان کیا ہے۔اس کے علاوہ بیدی نے بیوہ عورتوں کے مسائل کی طرف بھی توجہ دی ہے۔بعض معاشروں میں بیوہ عورت کو ہمدردی کے بجائے نفرتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔افسانہ 'من کی من میں' میں بیدی نے اس پہلو کو نمایاں کیا ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ عورت کی زندگی شوہر کے انتقال کے بعد کس طرح مختلف مسائل سے دوچار ہو جاتی ہے اور عورت اپنوں پر بوجھ بن جاتی ہے۔

بیدی کے افسانوں کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ انھوں نے عورت کو صرف ہمدردی کا موضوع نہیں بنایا بلکہ اس کے حقیقی مسائل اور احساسات کو پوری دیانت داری کے ساتھ پیش کیا۔ ان کی تحریروں میں عورت ایک زندہ اور متحرک کردار کی حیثیت رکھتی ہے، جو حالات سے متاثر بھی ہوتی ہے اور ان کا مقابلہ بھی کرتی ہے۔

راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں کا ایک نہایت اہم اور منفرد پہلو ان کے نسوانی کرداروں کی نفسیاتی تصویر کشی ہے۔ اگرچہ اردو کے دیگر افسانہ نگاروں نے بھی نفسیاتی عناصر کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے، لیکن بیدی نے جس گہرائی اور وسعت کے ساتھ عورت کی داخلی کیفیتوں، ذہنی کشمکش اور جذباتی پیچیدگیوں کو پیش کیا ہے، وہ انھیں دوسرے افسانہ نگاروں سے ممتاز بناتا ہے۔ ان کے نزدیک عورت صرف ایک سماجی کردار نہیں بلکہ احساسات، خواہشات، محرومیوں اور ذہنی الجھنوں سے بھرپور ایک مکمل انسان ہے۔ بیدی کے نسوانی کرداروں کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کے کردار محض ظاہری حالات کا شکار نہیں ہوتے بلکہ ان کے اندر ایک ایسی دنیا بھی موجود ہوتی ہے جو مختلف جذباتی اور نفسیاتی مسائل سے عبارت ہوتی ہے۔ وہ عورت کے ذہن کے ان گوشوں کو بھی سامنے لاتے ہیں جن پر عام طور پر کم توجہ دی جاتی ہے۔ ان کے افسانوں میں عورت کے احساسِ محرومی، خوف، عدمِ تحفظ، تنہائی اور جذباتی اضطراب کو نہایت باریک بینی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

بیدی کا یہ کمال ہے کہ وہ اپنے کرداروں کی نفسیات کو صرف بیان نہیں کرتے بلکہ ان کے ذہنی رویوں اور طرزِ عمل کے اسباب کو بھی واضح کرتے ہیں۔ ان کے کرداروں کے عمل اور ردِعمل کے پیچھے نفسیاتی عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ اس طرح قاری کرداروں کے ظاہر اور باطن دونوں سے واقف ہو جاتا ہے۔افسانہ 'لاجونتی' اس اعتبار سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ یہ افسانہ تقسیمِ ہند کے پس منظر میں لکھا گیا ہے اور اس میں عورت کی نفسیاتی کیفیتوں کی بڑی مؤثر تصویر پیش کی گئی ہے۔ اس افسانے میں بیدی نے ایک ایسی عورت کی ذہنی اور جذباتی حالت کو پیش کیا ہے جو اغوا اور سماجی حادثات کے بعد دوبارہ اپنے گھر واپس آتی ہے۔ اگرچہ معاشرہ اور اس کا شوہر بظاہر اسے قبول کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن حقیقت میں وہ پہلے جیسی جگہ نہیں بنا پاتی۔ بیدی نے اس افسانے میں مرد کی نفسیات کے ساتھ ساتھ عورت کے احساسات کو بھی نہایت گہرائی سے پیش کیا ہے۔عورت کے اندر یہ احساس موجود رہتا ہے کہ وہ اپنے ہی گھر میں اجنبی بن چکی ہے۔ وہ بظاہر اپنے خاندان کا حصہ ہوتی ہے لیکن ذہنی طور پر خود کو الگ تھلگ محسوس کرتی ہے۔ اس طرح بیدی نے عورت کی اس داخلی تکلیف کو نمایاں کیا ہے جسے صرف ظاہری رویوں سے نہیں سمجھا جا سکتا۔

اسی طرح افسانہ 'من کی من میں' میں عورت کی نفسیاتی الجھنوں کا ایک مختلف پہلو سامنے آتا ہے۔ اس افسانے میں بیدی نے عورت کے احساسات، خواہشات اور ذہنی پیچیدگیوں کو نہایت حقیقت پسندانہ انداز میں بیان کیا ہے۔عورت کے دل میں پیدا ہونے والے خیالات، اس کے جذباتی ردِعمل اور اس کے ذہنی انتشار کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ کردار ایک حقیقی انسان معلوم ہونے لگتا ہے۔ بیدی نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ معاشرتی پابندیاں اور خاندانی نظام عورت کی نفسیات پر گہرے اثرات مرتب کرتے

ہیں۔ جب عورت مسلسل دباؤ، بے توجہی یا محرومی کا شکار رہتی ہے تو اس کے اندر احساسِ کمتری اور مایوسی پیدا ہونے لگتی ہے۔ یہ ذہنی کیفیت آہستہ آہستہ اس کی شخصیت پر اثر انداز ہوتی ہے اور اس کے رویوں میں تبدیلی پیدا کر دیتی ہے۔

عورت کی نفسیات کے حوالے سے بیدی نے محبت، محرومی اور جذباتی وابستگی کے پہلوؤں کو بھی اہمیت دی ہے۔ انسان فطری طور پر محبت اور توجہ کا خواہش مند ہوتا ہے، لیکن جب عورت کو یہ چیزیں حاصل نہیں ہوتیں تو اس کے اندر ایک قسم کی ذہنی بے چینی اور اضطراب پیدا ہو جاتا ہے۔ بیدی نے ان نفسیاتی کیفیتوں کو نہایت فنی انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں عورت کے کردار صرف رونے اور ظلم سہنے والے کردار نہیں ہیں بلکہ وہ سوچنے، محسوس کرنے اور اپنے حالات کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ ان کی نفسیاتی کشمکش دراصل اس سماج کی عکاسی کرتی ہے جس میں عورت کو مختلف قسم کی پابندیوں اور مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

راجندر سنگھ بیدی انسانی زندگی کے گہرے مشاہدہ کار تھے۔ انھوں نے معاشرے کو صرف اس کی ظاہری صورت میں نہیں دیکھا بلکہ اس کے پوشیدہ اور پیچیدہ پہلوؤں کا بھی باریک بینی سے مطالعہ کیا۔ ان کے افسانوں میں عورت کا کردار صرف ایک ضمنی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ وہ ایک ایسے زندہ اور متحرک کردار کے طور پر سامنے آتی ہے جس کے اپنے جذبات، خواہشات، مسائل اور حقوق ہیں۔

بیدی کے تصورِ نسواں کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ عورت کو محض کمزور یا بے بس مخلوق کے طور پر پیش نہیں کرتے۔ اگر چہ ان کے افسانوں میں عورت مظلوم بھی نظر آتی ہے اور سماجی جبر کا شکار بھی، لیکن اس کے باوجود وہ اس کے اندر موجود قوتِ برداشت، صبر اور جذباتی طاقت کو بھی اجاگر کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک عورت زندگی کے مختلف مسائل اور مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے بھی اپنی شخصیت اور وقار کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ انھوں نے عورت کے مختلف مسائل کو پیش کرتے ہوئے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ معاشرے کو عورت کے ساتھ اپنے رویے میں تبدیلی لانی چاہیے۔

بیدی کے افسانوں میں عورت کی شخصیت کا ایک اور اہم پہلو اس کی نفسیاتی اور جذباتی دنیا ہے۔ انھوں نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ عورت کے مسائل صرف ظاہری نہیں ہوتے بلکہ اس کے ذہن اور احساسات بھی مختلف کشمکش کا شکار رہتے ہیں۔ اس لیے اگر عورت کے مسائل کا صحیح حل تلاش کرنا ہے تو اس کی داخلی کیفیتوں اور نفسیاتی ضروریات کو بھی سمجھنا ضروری ہے۔ ان کے افسانوں میں عورت کی تصویر کشی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ عورت کے وقار اور اس کے بنیادی حقوق کے حامی تھے۔ اگر چہ انھوں نے براہ راست اصلاحی نعرے نہیں دیے، لیکن ان کے افسانوں کے ذریعے ایک ایسا پیغام ضرور سامنے آتا ہے جو معاشرتی اصلاح کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

آخر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ راجندر سنگھ بیدی کے افسانوی ادب میں زندگی کے مختلف موضوعات کو نہایت فنی مہارت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، لیکن عورتوں کے مسائل کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ انھوں نے عورت کے سماجی، معاشی، نفسیاتی اور خاندانی مسائل کو گہرائی کے ساتھ بیان کیا ہے اور ان پر ہونے والی ناانصافیوں اور مظالم کو نمایاں کیا ہے۔

بیدی کے افسانے صرف فکری اعتبار سے اہم نہیں ہیں بلکہ فنی سطح پر بھی بلند مقام رکھتے ہیں۔ پلاٹ کی مضبوطی، کردار نگاری کی نفسیاتی تجزیہ، جزئیات نگاری اور حقیقت نگاری ان کے فن کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ یہی عناصر ان کے افسانوں کو اردو ادب میں ایک ممتاز مقام عطا کرتے ہیں۔ ان کی تحریریں آج بھی اپنی معنویت برقرار رکھے ہوئے ہیں اور انسانی زندگی کے مسائل کو سمجھنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

❐❖❐

Md. Shadab Shamim
D-35, Shaheen Bagh
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi-110025
Mob: 9643885605

ممتاز شیریں

فلک چومنے کی کوشش کرتی بیٹیاں

کئی برسوں سے ہمارے معاشرے میں خاموش مگر نہایت گہری تبدیلی جنم لے رہی ہے۔آج کا عہد کسی معمولی تبدیلی کا عہد نہیں بلکہ یہ شعور کے اس دریا کا ابھار ہے جس نے فرسودہ روایتوں کے سنگلاخ کناروں کو خاموشی سے کاٹنا شروع کر دیا ہے ایک وقت تھا جب معاشرہ عورت کو محض ایک بند دریچے کے مانند دیکھتا تھا جس کے حصے میں صرف خاموشی اطاعت اور محدود خواہشیں لکھی گئی تھی ۔

مگر وہی عورت اپنی ذات کے نہاں خانوں سے ابھر کر آفتاب کی طرح طلوع ہورہی ہے اس کی فکر میں اجالوں کی حدت ہے،اس کے لہجے میں آگہی کی چمک ہے،اور اس کے قدموں میں وہ استقامت ہے جو صدیوں کے جمود کو شکست دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔۔

یوں محسوس ہوتا ہے جیسے صدیوں سے دبائی گئی روشنی نے آخر کار اپنی پیشانی سے اندھیروں کی گرد جھاڑ دی ہو،اور وقت کے وسیع وعریض صحرا میں جہاں کبھی عورت کے خواب ریگزار کی خاموش ریت میں دفن کر دیے جاتے تھے آج وہی خواب آسمان کی پیشانی پر جگمگاتے ستاروں کے مانند ثبت ہورہے ہیں۔

ایک وقت ایسا بھی تھا جب لڑکی کی کامیابی کو صرف گھریلو تربیت تک محدود سمجھا جاتا تھا۔اس کے خوابوں کی حد اکثر ایک مختصر دائرے میں قید رکھی جاتی تھی۔مگر آج کی لڑکی نے ان تمام فرسودہ در و دیوار پر اپنی قابلیت سے دستک دی ہے وہ اب محض خواب نہیں دیکھتی بلکہ خوابوں کی تعبیر بھی خود لکھتی ہے۔اس کے ہاتھ میں قلم بھی ہے قانون بھی تحقیق بھی قیادت بھی اور شعور کی وہ روشنی جو پورے معاشروں کو منور کر رہی ہے۔

گزشتہ کئی برسوں سے مسلسل یہ مشاہدہ کیا جا رہا ہے کہ لڑکیاں تعلیمی میدان میں نمایاں کامیابی حاصل کر رہی ہیں۔

حالیہ برسوں کے تعلیمی اعداد و شمار اس حقیقت کی واضح گواہی ہیں" سی بی ایس سی اور آئی سی ایس سی اور یوپی بورڈ کے دسویں جماعت اور بارہویں جماعت کے نتائج میں لڑکیوں نے برتری حاصل کی لڑکیوں کے نتائج 99 فیصد سے بھی اوپر رہے۔مہاراشٹر، دہلی کے علاوہ پنجاب اور چھتیس گڑھ اور یوپی جیسے ریاستی بورڈ میں بھی لڑکیوں نے مستقل برتری دکھاتی لڑکیوں کی کامیابی کا تناسب ہر جگہ 99 فیصد رہا۔

اپنی لگن، محنت، مستقل مزاجی اور تعلیمی برتری سے امسال بھی لڑکیوں نے نمایاں سبقت حاصل کر کے نئی مثال قائم کی۔یہ اعداد و شمار محض نمبروں کی برتری نہیں بلکہ ایک خاموش جدوجہد کی داستان ہے جو گھریلو ذمہ داریوں سماجی دباؤ اور محدود وسائل کے باوجود جاری رہتی ہیں۔یو پی کے سیتاپور اور بارہ بنکی جیسے اضلاع کی

طالبات کا فہرست میں نمایاں ہونا اس حقیقت کی نشان دہی کرتا ہے کہ صلاحیت کا تعلق صرف بڑے شہروں سے نہیں بلکہ عزم اور محنت سے ہوتا ہے۔۔

ملک کی مختلف ریاستوں کے بورڈ نتائج اس حقیقت کی گواہی دیتے ہیں کہ بیٹیاں صرف خواب نہیں دیکھ رہی ہیں بلکہ ان خوابوں کو تعبیر بھی عطا کر رہی ہیں۔شاندار کامیابی کا تناسب اس بات کا ثبوت ہے کہ اگر موقع میسر ہو تو لڑکیاں ہر میدان میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا سکتی ہیں۔

یہ برتری محض نمبروں کا فرق نہیں بلکہ بدلتے ہوئے شعور کی علامت ہے۔ آج کی لڑکی اپنے خوابوں کو محض سوچتی نہیں انہیں حقیقت میں بدلنے کی خاموش استقامت کے ساتھ جدوجہد بھی کرتی ہے۔وہ رات کی تنہائیوں میں کتابوں سے رشتہ جوڑتی ہے، وقت کو نظم میں ڈھالتی ہے اور پھر اپنی محنت سے کامیابی کے دروازے کھول دیتی ہے۔

قومی شماریاتی اعداد و شمار بھی اس تبدیلی کی تصدیق کرتے ہیں۔حالیہ رپورٹس کے مطابق ہندوستان میں اب اسکول سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک کئی مقامات پر لڑکیوں کی تعداد لڑکوں سے کہیں زیادہ ہے۔تعلیم کے ایوانوں میں آج لڑکیوں کی کامیابی محض ایک اتفاق نہیں بلکہ بدلتے ہوئے شعور کی زندہ علامت ہے وہ خاموشی سے اپنے خوابوں کی آبیاری کرتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب نتائج کی فہرستیں سامنے آتی ہیں تو اکثر نمایاں نام لڑکیوں کے دکھائی دیتے ہیں۔

یہ تصدیق اس بات کا ثبوت ہے کہ عورت اب صرف گھر کی چار دیواری تک محدود نہیں ہے بلکہ علم و شعور اور قیادت کے میدان میں بھی اپنی مستقل شناخت قائم کر رہی ہے۔

سول سروسز جیسے مشکل امتحانات میں بھی خواتین امیدواروں کی تعداد بڑھ رہی ہے، 2024 کے سول سروس امتحان میں ایک خاتون شکتی دوبے اول رہی ہیں جبکہ ہرشیتا گوئل دوسرے نمبر پر رہی ہیں۔ اس سال اول 25 کامیاب امیدواروں میں 11 خواتین تھیں۔ جبکہ 1009 میں سے 284 خواتین تھیں یعنی جو تقریباً 28 فیصد ہے۔2025 کے نتائج میں راجیشوری سووے دوسرے نمبر سے رہیں۔مجموعی طور پر میرٹ لسٹ میں سے 25 کامیاب امیدواروں میں 11 یعنی آدھے کے قریب خواتین ہیں۔ مجموعی طور پر سال 958 امیدوار کامیاب ہوئے جس میں 299 خواتین تقریباً 32 فیصد ہیں۔

ملک کے سب سے بڑے امتحان میں خواتین کی لگاتار کامیابی یہ ظاہر کرتی ہے کہ عورت میں صبر توجہ اور مستقل مزاجی کی غیر معمولی قوت موجود ہے۔وہ محدود وسائل اور سماجی دباؤ کے باوجود اپنے خوابوں کا دامن مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں۔

کھیل کے میدان میں بھی یہی منظر دکھائی دیتا ہے ،عورت

کھلاڑی صرف تمغے نہیں جیت رہی ہے بلکہ صدیوں پرانی روایات، تصورات کو شکست دیتی نظر آرہی ہے۔ ان کی ہر کامیابی یہ اعلان کرتی ہے کہ صلاحیت کا تعلق جنس سے نہیں بلکہ عزم اور محنت سے ہے۔

ماہرین تعلیم اور مختلف تعلیمی رپورٹس کے مطابق لڑکیوں کی بہتر کارکردگی کے پیچھے کئی سماجی، نفسیاتی اور تعلیمی اسباب کارفرما ہیں۔ تحقیق یہ بتاتی ہے کہ لڑکیاں عموماً پڑھائی میں زیادہ تسلسل، نظم وضبط اور سنجیدگی کا مظاہرہ کرتی ہیں اسی لیے وہ امتحانات کو زیادہ ذمہ داری سے لیتی ہیں خاص طور پر دیہی اور متوسط طبقے کے طالبات میں یہ احساس نسبتاً زیادہ پایا جاتا ہے کہ تعلیم ہی ان کی خودمختاری اور بہتر زندگی کا راستہ ہے، جبکہ لڑکے نسبتاً زیادہ توجہ بٹنے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ لڑکیاں تعلیم کو صرف ڈگری نہیں بلکہ اپنی شناخت، خوداعتمادی اور مستقبل کی روشنی سمجھ کر حاصل کر رہی ہیں اور شاید یہی احساس ان کی کامیابی کا سب سے بڑا سبب ہے۔

آج کی عورت محض زمانے کے ساتھ قدم نہیں ملا رہی ہے بلکہ زمانے کی سمت متعین کر رہی ہے وہ کتاب کے اوراق سے نکل کر فیصلوں کے ایوانوں تک جا پہنچی ہے اس کی آنکھوں میں صرف خواب نہیں تعبیر کی روشنی بھی جاگتی ہے وہ ثابت کر رہی ہے کہ حوصلہ اگر سچا ہو تو کمزور سمجھی جانے والی ہتھیلیاں بھی تقدیر کا رخ موڑ سکتی ہیں۔

یہ کامیابی کسی ایک فرد کی نہیں بلکہ صدیوں سے خاموش قربانیوں اور مسلسل جدوجہد کا ثمر ہیں۔ آج جب ایک لڑکی امتحان میں اول آتی ہے اور میرٹ کی پیشانی پر اپنی محنت کا چراغ روشن کر دیتی ہے،، ہوائی جہاز اڑاتی ہے، اور جب میدان میں قدم رکھتی ہے تو شکست کے مفہوم بدل جاتے ہیں یا جب وہ قلم اٹھاتی ہے تو لفظوں میں آگہی اترتی ہے، اور کسی بڑے منصب تک پہنچتی ہے تو وہ اپنے ساتھ بے شمار خوابوں کو بھی جلا بخشتی ہے جو کبھی سماج کے اندھیروں میں دب گئے تھے۔ آج اپنی نگاہ کے ارتکاز سے زمانے کی سمت متعین کر رہی ہے۔ اس کی کامیابی میں ہر چند اسناد یا منصبوں کی داستان نہیں بلکہ اس ایک خاموش انقلاب کی بازگشت ہے جو برسوں سے نسوانی روح کے اندر پل رہا تھا۔

دور اب بدل چکا ہے برتری جنس کی نہیں ذہن کی ہے؛ نام اب وراثت سے نہیں محنت لگن مستقل مزاجی سے بنتے ہیں اور شاید یہی اس عہد کی سب سے روشن حقیقت ہے کہ عورت اب کسی کہانی کا کردار نہیں رہی بلکہ خود اپنی تقدیر کی مصنف بن چکی ہے۔

❐❖❐

Dr. Mumtaz Shiren
C/o Ajmal Husain
North to water Tank,
015P Takiya Kawaldah
Post،Surya Vihar Colony
Gorakhpur -273015 (Uttar Pradesh)

زیبا پروین

اردو اور میتھلی کے لسانی رشتے

دنیا کی موجودہ زبانوں میں ایک بھی ایسی نہیں جو اکیلی کسی ایک قوم کی آغوش میں پلی ہو، زبان کی پیدائش کے متعلق مختلف نظرئے پیش کیے جاتے رہے پر صحیح یہ ہے کہ زبان آوازوں کے ایک ایسے مجموعے کا نام ہے جس سے انسان اپنا خیال دوسروں پر ظاہر کرنے کے لیے ارادتاً نکالتا ہے اور اس میں ذات ، مذہب اور برادری کوئی معنی نہیں رکھتی۔زیادہ تر آدمی اپنے خیالات وجذبات کا اظہار اپنی مادری زبان میں آسانی سے کرتے ہیں کسی بھی زبان پر کسی کا پیدائشی حق نہیں ہوتا۔یہ الگ بات ہے کہ جو جس علاقہ کا رہنے والا ہوتا ہے وہ اس زبان میں جو اس علاقے میں بولی پڑھی اور لکھی جاتی ہے بولتا ہے۔تمل ناڈو میں رہنے والا تمل،آندھرا میں رہنے والے تلگو اور اردو، کیرالہ میں ملیالم، اڑیسہ میں اڑیہ، گجرات میں گجراتی زبان میں لوگ بات کرتے اور اس پر فخر محسوس کرتے ہیں۔

صوبہ بہار کا وہ خطہ جسے متھلا کے نام سے جانا جاتا ہے صدیوں سے علم وادب کا گہوارہ رہا ہے۔اس علاقہ میں رہنے والے عوام خصوصاً بول چال کی زبان میں میتھلی ہی استعمال کرتے ہیں اہل متھلا کے علاوہ یہاں کے مسلمانوں نے اردو زبان کے علاوہ میتھلی زبان کو بھی اپنے خون جگر سے سینچا اور اس کی نشوونماں میں اہم رول ادا کیے یہ ہم اردو بولنے والوں پر متھلا کلچر کے ہی اثرات ہیں جس کی وجہ سے ہم نے اس علاقہ کا رہن سہن ،آپسی میل محبت و بھائی چارگی، لوک گیت،عوامی ڈرامہ،عوامی کہانیوں کے ساتھ ساتھ ان کی موسیقی کو بھی اپنانے میں جھجھک محسوس نہیں کی جس کی وجہ سے یہ زبان یہاں کی اکثریت کی زبان ہونے کے ساتھ ساتھ عوام الناس کی زبان ہوگئی ،اور آج یہ زبان اس علاقہ میں کامیاب صرف اس لیے ہے کہ پڑھے لکھے طبقوں کے علاوہ یہ زبان عام لوگوں کی زبان ہوگئی، اس زبان کو بولنے والے کسی خاص مذہب یا فرقہ کے نہیں بلکہ اس علاقہ میں رہنے والے لوگ ہیں۔جب مسلمانوں کی آمد یہاں ہوئی تو یہاں کے لوگوں نے ان سے فارسی اردو اور عربی زبان سیکھی جس سے مقامی زبان متاثر ہونے لگی اور زبان کا ارتقا ہوا۔میتھلی میں عربی، فارسی اور اردو کے بہت سے الفاظ کہاوت اور محاروہ آئے جس سے میتھلی زبان کا حلقہ وسیع ہوا۔مہاکوی ودیا پتی کے ''کرتی لتا''اور کرتی پتا کا'' میں اس کی مثالیں ملتی ہے مسلمانوں کے رہن سہن اور اخلاق پر دیکھئے کیا کہتے ہیں۔

کتھو بانگ کتھو وید　　کتھو بسمل کتھو چھید
کتھو اوجھا، کتھو کھوجا　　کتھو مُکت کتھو روزہ
کتھو تمہارد کتھو کوجا　　کتھو نماز کتھو پوجا

میتھلی زبان وادب پر اردو کے بھی اثرات پڑے تاہم فارسی اور سنسکرت کے الفاظ کا استعمال اب دھیرے دھیرے کم ہوتا جارہا ہے زمانۂ حال میں میتھلی زبان دیگر زبانوں سے بھی الفاظ لے کر اپنی ادبی سرزمین کو ذرخیز بنانے میں لگی ہوئی ہے۔

جدید ہندوستانی زبان میں سب سے پرانی زبان میتھلی رہی ہے اس کا اپنا رسم الخط، اپنی لغت، اپنی قواعد اپنی ایک الگ شناخت ہے۔1955 میں اسے مادری زبان کے طور پر پڑھنے کی اجازت ملی اور بہار میں جو یونیورسٹیاں کھلیں ان میں میتھلی کا شعبہ قائم کیا گیا۔1965 میں اس زبان کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے ساہتیہ اکادمی میں اس کو بھی جگہ ملی۔1972 میں یہ بہار پبلک سروس کمیشن میں داخل ہوئی۔ پھر یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے جے۔آر۔ایف اور ایس۔آر۔ایف میں شامل کر اس زبان کی اہمیت کو مضبوطی بخشی۔اب تو اس زبان میں ہندوستانی آئین کا بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔

سابق ترہت یعنی دربھنگہ اور سہرسہ کے قدیم مقام کو میتھلی کی جائے پیدائش ہونے کا فخر حاصل ہے۔ پورنیہ، بھاگلپور اور مونگیر کے علاقہ کے لوگ کچھ میتھلی اور بنگالی سے متاثر ہوکر ایک الگ انگیکا زبان بولتے ہیں۔ علاقائی زبانوں میں میتھلی اپنی دو معاصر زبانوں بھوجپوری اور مگہی سے زیادہ طاقتور زبان بن کر ابھری۔ بھوجپوری اور مگہی نے جہاں ادبی ضروریات کی تکمیل کے لیے برج بھاشا کا سہارا لیا وہاں میتھلی نے خود کو وسیلۂ اظہار بنایا۔ متھلا کے گاؤں کے عوام خصوصاً ہندو عوام کی بول چال کی زبان ہر دور میں میتھلی ہی رہی مگر میتھلی اور اردو دو متوازی خطوط پر برابر ارتقا پذیر رہی اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اردو اور میتھلی اس علاقے کی قدیم زبان ہے۔ بعض مسلم طبقے اردو اور میتھلی کے بیچ کی زبان بولتے ہیں۔ جسے ماہر لسانیات ڈاکٹر جان ابراہیم گریسن نے ”جولہی میتھلی“ کا نام دیا ہے، جس کی مثالیں ہمیں بہار کے بہت سے مصنفین کی تخلیقات میں مل جاتی ہیں جن میں سہیل عظیم آبادی، ش مظفرپوری کے نام خصوصی طور پر اہم ہیں۔

بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں میتھلی ترہوتا رسم الخط میں لکھی گئی تھی مگر بعد میں اس نے دیوناگری رسم الخط کو اختیار کرلیا تو دیگر زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو کے الفاظ محاورات اور ضرب الامثال اس زبان میں اپنی جگہ بنانے لگے۔ میتھلی میں شاعری، ناول، افسانہ، سفرنامہ، سوانح، ڈرامے، تنقیدی مضامین خاکہ اور طنز و مزاح کے علاوہ طویل نظم بھی لکھی گئی جن میں میتھلی لکھنے والے سبھی ادیبوں نے اردو کے الفاظ استعمال کیے۔ جن میں ویدیا ناتھ مشر، شری ڈاکٹر ہری موہن جھا، کاشی کانت مشرا، سریندر جھا، کانچی ناتھ جھا، اوبندر ٹھاکر، موہن راج کمل چودھری، ڈاکٹر جے دھاری سنگھ، ناگا ارجن وغیرہ شامل ہیں۔

تو ہر من دورَیت چھو کوٹھاک دِس
پیدھ پیدھ دھانِک دس دربارک دِس
غریبک دس کگر جائت جھے نجری
کے تکیت چھی ہمر نورک دس

میتھلی زبان وادب کے مشہور مزاح نگار پروفیسر ہری موہن جھا جنھوں نے میتھلی زبان وادب کو عوام الناس کے بیچ مقبول کیا ان کے اشعار دیکھیے کہ کس طرح ہندوستان میں غریبی اور مہنگائی پر طنز کرتے ہیں:

بھات بھیل درلبھ بھارت میں سپنا دھانک ڈھیر
مکئی مکھانک کان کٹیت چھئے الوہا کھا چھی کو بیر
مروا مسرک بھاؤ بیکا ئچھ جیرک بھاؤ جنیر
سب سے بربک ان کھساری سے ہو روپے سیر

اس کے علاوہ میتھلی گیتوں، غزلوں میں بھی اردو کے اثرات واضح طور پر نظر آئے ہیں، شیخ شبیر احمد زخمی کا گیت ہے جس میں اردو کے الفاظ، اللہ، روپیہ، برف، کمبل جیسے الفاظ دیکھنے کو ملتے ہیں، اس کے علاوہ میتھلی رسائل اور جرائد میں اردو کی آمیزش نظر آتی ہے۔

نیپال کی ترائی میں بسا یہ علاقہ جسے متھلا یا ترہت اور زمانہ قدیم میں ویدیہ کے نام سے جانا جاتا تھا تقریباً 7 کروڑ کی آبادی پر مشتمل ہے۔ یہ علاقہ اپنی تہذیبی شناخت رکھتا ہے۔ بلاشبہ جب ہم بھائی چارگی کے ساتھ رہتے ہیں تو ہماری زندگی کا ہر پہلو ایک دوسرے سے متاثر ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اردو کے مشہور شاعر حافظ عبدالمنان طرزی یا پروفیسر شاکر خلیق بھی یہاں کے مقامی زبان و کلچر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ شاکر خلیق نے اپنی ایک نظم ”یہ متھلا کی سرزمین“ میں کہا

یہ مانچھ اور مکھان کی
یہ دھان اور پان کی
یہ کھیت اور کسان کی
جیالے نوجوان کی
ہری بھری ہے یہ زمین
یہ متھلا کی سرزمین

اسی نظم میں قدرتی مناظر اور سماجی زندگی کی خوشبو محسوس ہو رہی ہے۔

میتھلی زبان وادب کی ترقی میں آزادی کے بعد اور آزادی سے قبل دو طرح کی کوششیں ہو رہی تھی ایک ادبی اور دوسری تحریکی

جس میں مسلمانوں نے بھی میتھلی زبان کی فلاح کے لیے اہم رول ادا کیے۔ جہاں گاؤں کے لوگ میتھلی زبان بولتے رہے وہیں کچھ لوگ ادبی کاموں میں بھی دلچسپی لیتے رہے۔

میتھلی زبان وادب کی تاریخ میں مسلمانوں میں سب سے پہلا نام نتوری کوی کا ہے (نام سے مسلمان ہی معلوم ہوتے ہیں) میتھلی کے ادیب کپور چند اچھا کے ہم عصروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ نتوری کوی نے متھلا کا خاکہ جس طرح اپنی تحریروں میں پیش کیا ہے وہ اپنے آپ میں انوکھا ہے اور وہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ متھلا کا علاقہ صرف بڑے بڑے دانشوروں کا نہیں بلکہ غریب کسانوں کا بھی ہے۔

جدید میتھلی ادب میں جناب فضل الرحمٰن ہاشمی (بیگوسرائے) کا نام بھی اہمت کا حامل ہے ایک طرف شعری تخلیق کے لیے میتھلی ادب میں مشہور ہیں تو دوسری طرف ارود کی کئی کتابوں کا ترجمہ انھوں نے میتھلی میں کیا۔ اس کتاب کی بنیاد پر 1994 میں ساہتیہ اکادمی نئی دہلی نے انھیں انعام سے نوازا۔ میتھلی کی ترقی میں انھوں نے اہم رول ادا کیا۔ ان کی انہیں کاوشوں کی بنیاد پر ان کا شمار میتھلی کے صف اول کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں متھلا کی حقیقت (بھوک سے بلکتے روتے لوگوں کا) خاکہ کچھ اس طرح کھینچا ہے۔

پتر اک آواز سے کریجا کانپ گیل چھی
راشن نہیں چھیک بابو، بھنسر سے بھوکلے چھی
ہم کچھا کاندھا پر راکی کر بڑھی ریل چھی
دمکانک دس ادھارک خاطر

ناظم رضوی صاحب (منی گاچھی) کو کون بھول سکتا ہے جو اپنے تخلیقی کاموں کے علاوہ میتھلی زبان کی ترقی کے لیے تحریکی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے ہیں میتھلی زبان کو مسلمانوں کے بیچ گاؤں گاؤں میں روشناس کروایا۔

ہم نہ ہندو چھی نہ مسلمان
میتھل چھی میتھلی ہمر پران

میتھلی لیل مٹا دیب سبھ اپن
کم دیکھیت نہیں لکھنو بھوسک سینا

جناب شوکت خلیل صاحب کے نام سے کون آشنا نہ ہوگا، انھوں نے بھی اپنی تخلیق میتھلی میں چھوڑی ہے۔ کچھ ادیبوں کا کہنا ہے کہ انھوں نے ایک غیر مطبوعہ میتھلی ناول بھی چھوڑا ہے۔ جدید میتھلی ادب میں ان کا اہم مقام ہے۔

سیف الرحمٰن کا نام بھی قابل ذکر ہے ان کی مطبوعہ میتھلی غزلیں میتھلی کے روشن مستقبل کی عکاسی کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ ضیاء الرحمٰن جعفری بھی ہندی کے علاوہ میتھلی میں لکھتے رہے۔

ماسٹر رستم علی میتھلی کے تخلیقی کاموں سے جڑے رہے اور میتھلی شاعری سے لوگوں کو لطف اندوز کراتے رہے ہیں۔ ان کے علاوہ ضیاء الرحمٰن، معین الدین انصاری، عتیق احمد، پرویز سیف رحمانی، احمد تنہا، امام اعظم، منظر سلمان، عائشہ عصمت اللہ اور فاطمہ وغیرہ نے میتھلی زبان وادب کے فروغ میں اہم رول ادا کیے ہیں۔

بنیادی طور پر دیکھا جائے تو ہندوستان میں ایک بڑی تعداد علاقائی زبانوں کی ہے جن سے ہندوستانی تہذیبی اور ثقافتی روح کی عکاسی ہوتی ہے، اور ان علاقائی زبانوں کا ادب بھی ثروت مند ہوا ہے۔ دیکھا جائے تو لسانی اور ثقافتی تنازعے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی کیونکہ زبان کا نہ ہی کوئی مذہب ہوتا ہے اور نہ ہی مذہب کی کوئی زبان ہوتی ہے۔ بلکہ الگ الگ مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والوں کی زبان بھی ایک ہوسکتی ہے۔ کنڑ، ملیالم، تلگو، تمل، اڑیا مختلف مذہبی طبقات کی زبانیں ہیں ان میں ہندو مسلم عیسائی سکھ سبھی شامل ہیں یہی معاملہ بہار کی دیگر زبانوں کا بھی ہے کہ مذہب کوئی بھی ہو زبان وہی ہوتی ہے جو اس علاقے میں مقبول ومروج ہوتی ہے۔ اسی طرح دیکھا جائے تو زبان کا مذہب سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم بہت سی علاقائی زبانوں کی ادبیات اور ان کے ثقافتی اور لسانی رجحانات اور رویوں سے واقف نہیں ہو پاتے جب کہ ہمیں ہندوستان کے تہذیبی تنوع کو جاننے اور سمجھنے کے لیے ان زبانوں سے رابطے کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا کرنی ہوگی۔ کیونکہ

ہندوستانی تہذیب صرف ایک زبان، ایک قوم ایک خطے پر مرکوز نہیں ہے اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندوستان کی ان زبانوں کے تراجم پر بھی زور دیا جائے، جہاں کی تہذیب وثقافت سے ہماری آشنائی نہیں ہے۔ اگر یہاں کی تہذیبی روح اور ثقافتی رمز کو سمجھنا ہے تو ہمیں علاقائی زبانوں پر توجہ دینی ہوگی اور مجھے لگتا ہے کہ اس کا سب سے بہترین ذریعہ تراجم ہیں۔ اس کے ذریعے ہم الگ الگ علاقوں اور مقامات کی رسمیات سے بھی واقف ہو سکتے ہیں۔ جس کی شروعات تو ہو چکی ہے مگر اس کی رفتار بہت دھیمی ہے۔

الغرض لسانی نقشے اور منظر نامے پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ مذہب اور عقیدے کے اختلاف کے باوجود لسانی سطح پر اتحاد اور یکسانیت ہے اور یہی ہمارے ملک کا حسن ہے۔

حوالے

(1) ہسٹری آف میتھلی لٹریچر (جے کانت مشرا)

(2) بزم شمال (سعدان فاروقی)

(3) آج کل (جون 2003)

(4) راشٹریہ سہارا (28 اپریل 2002)

Dr. Zeba Perween

Assistant Prof. (Guest Faculty)

Dept. of Urdu, MLSM College,

Radio Station Road, North to Harahi Lake,

Darbhanga-846004(Bihar)

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

145 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.................................... بتاریخ..

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/145 روپے A/C: 90092010045326، IFSC:CNRB0019009 میں جمع کروا دیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159, E-mail:magazines@ncpul.in

دستخط

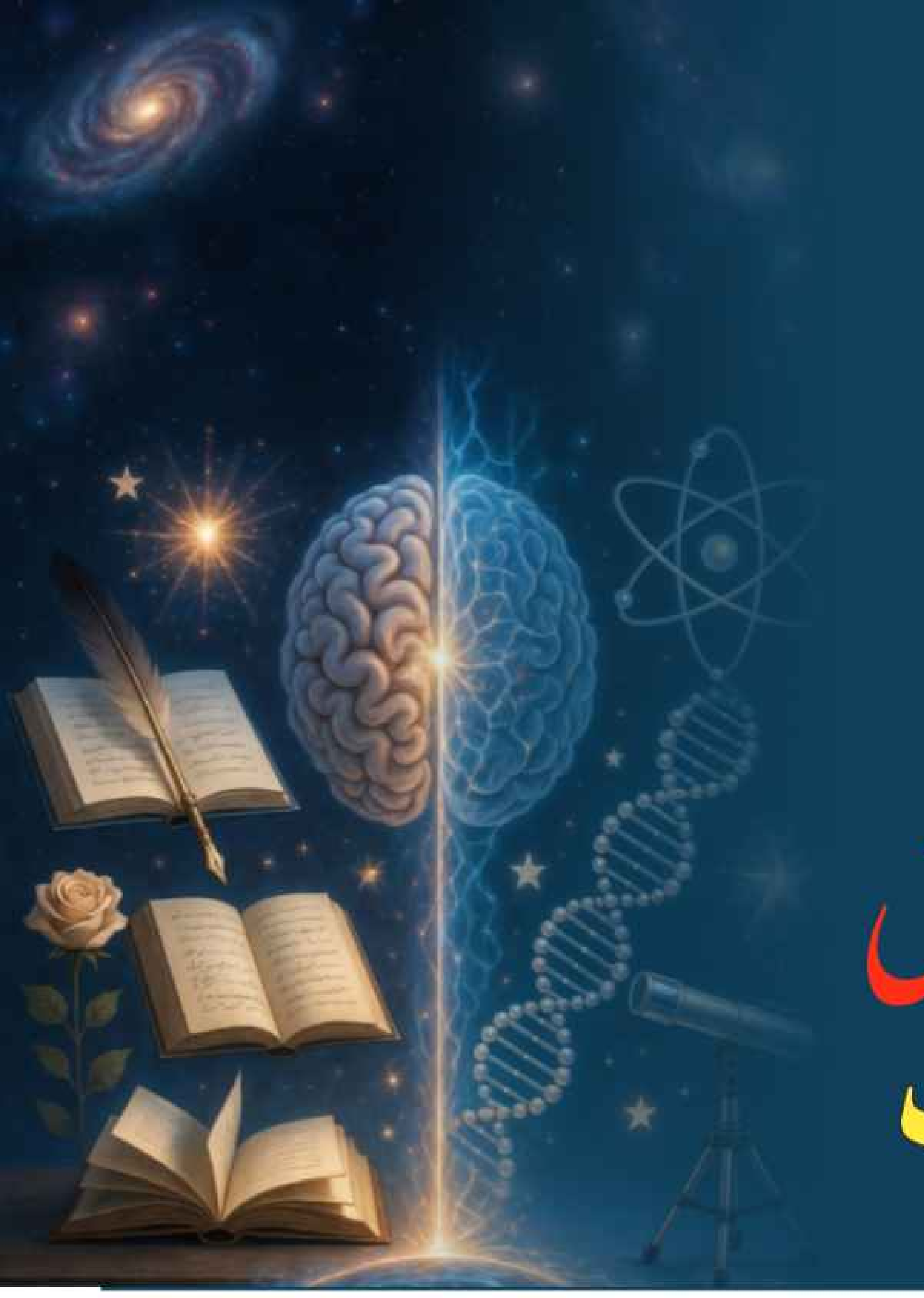

سیدہ نازیہ فاطمہ

ادب میں سائنسی تصورات کی پیش کش

ادب اور سائنس بظاہر دو متضاد دنیائیں معلوم ہوتی ہیں، لیکن گہرائی میں جائیں تو یہ دونوں انسانی شعور کی ہی دو تکمیل ہیں۔ ادب جذبات و احساسات کی دنیا سے تعلق رکھتا ہے، جب کہ سائنس عقل، تجربے اور مشاہدے سے۔ دونوں کا مقصد دراصل حقیقت کی کھوج ہے،ادب انسانی وجود کی اندرونی سچائی تلاش کرتا ہے اور سائنس خارجی کائنات کی۔ انیسویں صدی کے اواخر سے جب سائنسی انقلاب نے انسانی سوچ کو بدلنا شروع کیا، تو ادب نے بھی اپنی تعبیرات میں سائنسی فکر کی جھلک دکھانی شروع کر دی۔ ڈارون، نیوٹن، گلیلیو، آئن اسٹائن، میکس پلانک جیسے سائنس دانوں کی دریافتیں صرف تجربہ گاہوں تک محدود نہ رہیں؛ ان کے اثرات انسانی ذہن اور تخلیقی رویوں تک پہنچے۔ انسانی علوم وفنون کے درمیان فاصلے کم ہونا شروع ہوئے اور ادب نے سائنس کو موضوع، علامت، مزاج اور اسلوب کے طور پر اپنانا شروع کر دیا۔ اسی نکتے سے ایک نئے ادبی رجحان کی ابتدا ہوئی جس نے آگے چل کر اردو ادب سمیت دنیا کی تمام ادبیات کو متاثر کیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''ادب کی اساس ''تخیل'' ہے جس میں احساس و جذبہ اثر و تاثیر کے رنگ بکھرتا ہے۔ سائنس کی بنیاد ''تجربہ'' ہے۔ تخیل سے ''خیال'' وجود میں آتا ہے جس پر سائنس اپنے تجربے کی بنیاد رکھتی ہے اور دریافت کی منزل سر کرتی ہے۔ اگر خیال نہ ہو تو ''تجربہ'' بھی عمل کی روشنی نہ دیکھے۔ پرندوں کی طرح اڑ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا انسان کی ہمیشہ سے خواہش رہی ہے۔ اس خواہش نے تخیل کے پروں پر اڑ کر تختِ سلیمانی، اڑن کھٹولا اور مثنوی سحر البیان کا ''کل کا گھوڑا'' تلاش کیا۔ دیو پریاں بھی اسی خواہش اور اسی خیال کا ایک روپ ہیں۔ سائنس نے قدم قدم تجربے کے عمل سے گزر کر کل کے گھوڑے کے تصور سے ہوائی جہاز ایجاد کیا۔ یاد آیا امریکہ کے ایک سائنس دان ہیں جو ادب بالخصوص فکشن، بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ ان سے کسی نے وجہ دریافت کی تو کہا کہ ادب پڑھنے سے بہت سے ایسے نئے خیالات ہاتھ آتے ہیں جن پر سائنسی تجربات کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جسے اگر سمجھ لیا جائے تو ادب اور سائنس کے درمیان فاصلہ کم ہو جائے۔''

(بحوالہ: ڈاکٹر جمیل جالبی، مشمولہ: ادب اور سائنس، مرتب جمال نقوی، 1998، ص:9)

سائنس نے انسان کو کائنات میں اپنی حیثیت سے آگاہ کیا۔ جہاں پہلے عقائد اور مابعد الطبیعی تصورات غالب تھے، وہاں اب تجربہ اور دلیل کو ترجیح دی جانے لگی۔ اس تبدیلی نے انسان کے اندازِ فکر کو بدل ڈالا۔ جب انسان نے زمین کو کائنات کے مرکز کی حیثیت سے ہٹ کر ایک معمولی سی گردش کرتی ہوئی سیارے کے طور

پر دیکھا، تو اس کی خودی کا مفہوم بھی بدلنے لگا۔ ادب چونکہ انسانی شعور کی آئینہ داری کرتا ہے، اس لیے اس تبدیلی نے اس پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ شعر و نثر دونوں میں محسوسات کے ساتھ ساتھ منطقی سوچ اور مشاہداتی وضاحت کی جھلک ابھرنے لگی۔ ادب میں اب صرف تقدیر اور احساس نہیں بلکہ تلاش، سوال، تجسس اور دریافت کے جذبات بھی شامل ہو گئے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سائنسی طرزِ فکر اور ادبی تخلیقیت کا سنگم وجود میں آیا۔ قاسم پیرزادہ اپنے مضمون ''ادب اور سائنس کی مشترکہ قدریں'' میں لکھتے ہیں:

> ''نہ سائنس ادب ہے اور نہ ادب سائنس مگر ان میں جو قدر مشترک ہے وہ انسان ہے کیونکہ اس کائنات میں جتنے بھی مظاہر ہیں ان کا تعلق سائنس اور انسان سے ہے اور وہی تعلق ادب کا بھی ہے جبکہ ایک روایت ادب کی ہے اور ایک سائنس کی۔ ان کی زبانیں بھی الگ الگ ہیں، سائنس جذبات سے عاری ہے جبکہ ادب سارے کا سارا جذبات سے تعلق رکھتا ہے۔ ادب میں الفاظ کی رنگینی ہے جبکہ سائنس میں مناسب الفاظ کا استعمال ہے۔ ہاں سائنس اور ادب میں کوئی تصادم نہیں ہے بلکہ سائنسی شعور رکھنے والا بہت گہری نظر رکھتا ہے۔ وہ اگر ادب کی طرف توجہ کرے تو اس کے لئے بہت مفید ثابت ہوگا۔ ادب چونکہ زندگی سے زیادہ قریب ہے اس لئے اس نے سائنس کو سینے سے لگایا ہے۔ موضوعات کے اعتبار سے اس کا استعمال سائنس میں کیا جاسکتا ہے۔''

(بحوالہ: قاسم پیرزادہ، مشمولہ: ادب اور سائنس، مرتب جمال نقوی، 1998، ص:16)

اردو ادب کی تاریخ میں سائنسی تصور سب سے نمایاں طور پر سر سید احمد خاں کی تحریکِ علی گڑھ سے وابستہ ہے۔ انہوں نے مذہب، عقل اور سائنس کو ہم آہنگ کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ سر سید نے یہ باور کرایا کہ جدید دنیا کو سمجھنے کے لیے سائنس کی معرفت لازمی ہے۔ ان کے مضامین اور بیانات میں سائنسی مشاہدے اور عقلی استدلال کا رنگ نمایاں ہے۔ اسی تحریک کے زیرِ اثر اردو ادب میں ایک نئی فکری سمت پیدا ہوئی جہاں شاعری اور نثر دونوں میں انسان، فطرت اور علم کے باہمی رشتے پر بحث ہونے لگی۔ حالی، شبلی، ڈپٹی نذیر احمد اور بعد میں اقبال، جوش ملیح آبادی جیسے مفکرین نے سائنسی حس کو اپنی تخلیقات میں جذب کیا۔ اقبال کی شاعری میں محض فلسفہ نہیں بلکہ طبیعیات، فلکیات اور حیاتیاتی اشارے بھی ملتے ہیں۔ ان کے ہاں کائنات جامد نہیں بلکہ حرکت پذیر اور توانائی سے لبریز دکھائی دیتی ہے۔

جب بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں ترقی پسند تحریک ابھری، تو ادب میں سائنس اور عقل پسندی کا رجحان مزید گہرا ہوگیا۔ ترقی پسند ادب نے سماج، سیاست اور معیشت کو سائنسی نتائج کی بنیاد پر سمجھنے اور بدلنے کی کوشش کی۔ فیض احمد فیض، سجاد ظہیر، کرشن چندر، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی اور احمد ندیم قاسمی جیسے ادیب اس فکر کے نمائندہ ہیں۔ ان کا ماننا تھا کہ ادب کو جذباتی یا خوابناک دائرے سے نکال کر حقیقت پسندانہ اور سائنسی بنیادوں پر قائم ہونا چاہیے۔ ان کہانیوں اور شاعری میں انسان کو حالات کا محکوم نہیں بلکہ بدلنے والا عامل تصور کیا گیا۔ یہ تصور دراصل سائنسی

منطق، یعنی علّت و معلول کے رشتے کو انسانی زندگی پر منطبق کرنے کی ایک ادبی صورت تھی۔ ترقی پسند تحریک نے ادب کو نہ صرف سماجی ادارے کے طور پر مضبوط کیا بلکہ اس میں استدلال، تجزیہ اور مشاہدے کی زبان کو بھی شامل کیا۔

آج جب پوری دنیا گلوبلائزیشن اور ڈیجیٹل علم کے دور میں داخل ہے، اردو زبان بھی اپنے تاریخی دائرے سے باہر نکل کر ایک عالمی زبان بن رہی ہے۔ جنوبی ایشیا کے علاوہ خلیجی ممالک، یورپ، امریکہ، کینیڈا، اور وسطی ایشیائی ریاستوں میں اردو پڑھائی اور سمجھی جا رہی ہے۔ آن لائن یونیورسٹیاں، یوٹیوب چینلز اور جدید تحقیقاتی جرائد اردو زبان میں سائنسی مباحث کو عام کر رہے ہیں۔ ہندوستان، پاکستان، برطانیہ اور خلیج کے اردو ادبا اب سائنسی اصطلاحات، مصنوعی ذہانت، ماحولیات اور بایو ایتھکس جیسے موضوعات پر تخلیق کر رہے ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اردو ادب میں جمود نہیں، بلکہ علم و سائنس کی حرکت کے ساتھ چلنے کی صلاحیت موجود ہے۔

جدیدیت کے دور میں سائنس محض مظاہرِ قدرت کے بیان تک محدود نہ رہی بلکہ انسانی وجود اور شعور کے اندر تک پہنچ گئی۔ مابعد جدیدیت نے اس فکری رشتے کو اور بھی پیچیدہ بنا دیا۔ اب سائنس کے ذریعے پیدا ہونے والی غیر یقینی، لامرکزیّت اور تجریدی حقائق نے ادب کو نئے ابعاد عطا کیے۔ غالب، اقبال، ن م راشد، فیض، انتظار حسین، شمس الرحمٰن فاروقی اور وزیر آغا جیسے شعرا و نقادوں نے اس فکری تغیر کو ادب میں دریافت کی نئی جہت دی۔ سائنسی تصورات مثلاً ''وقت کا نسبتی ہونا''، ''عالمِ ذرّات کی غیر یقینی حرکت''، اور ''انسانی شعور کی نفسیاتی پرتیں'' ادب کے علامتی اور فکری پیکروں میں شامل ہوگئیں۔ اس طرح علمِ سائنس نے ادب کی زبان اور اس کے تاثر کو محض خارجی مظاہر سے نکال کر باطنی تجربات اور فکری گہرائیوں تک پھیلایا۔

آج جب پوری دنیا گلوبلائزیشن اور ڈیجیٹل علم کے دور میں داخل ہے، اردو زبان بھی اپنے تاریخی دائرے سے باہر نکل کر ایک عالمی زبان بن رہی ہے۔ جنوبی ایشیا کے علاوہ خلیجی ممالک، یورپ، امریکہ، کینیڈا، اور وسطی ایشیائی ریاستوں میں اردو پڑھائی اور سمجھی جا رہی ہے۔ آن لائن یونیورسٹیاں، یوٹیوب چینلز اور جدید تحقیقاتی جرائد اردو زبان میں سائنسی مباحث کو عام کر رہے ہیں۔ ہندوستان، پاکستان، برطانیہ اور خلیج کے اردو ادبا اب سائنسی اصطلاحات، مصنوعی ذہانت، ماحولیات اور بایوایتھکس جیسے موضوعات پر تخلیق کر رہے ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اردو ادب میں جمود نہیں، بلکہ علم و سائنس کی حرکت کے ساتھ چلنے کی صلاحیت موجود ہے۔ اردو میں سائنس کی زبان ابھی ارتقائی مرحلے میں ہے، مگر کوششیں جاری ہیں کہ علمی مضامین، ناول، شاعری اور تنقید میں سائنسی زاویوں کو زیادہ سے زیادہ جگہ دی جائے۔

ادب ہمیشہ استعارات، علامتوں اور تمثیلات کے ذریعے حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب سائنس نے انسانی فہم کو بدل دیا، تو ان علامتوں کی ساخت بھی بدل گئی۔ پرانے وقتوں میں شاعر آفتاب، مہتاب، طوفان اور بجلی کو محض فطری مظاہر کے طور پر استعمال کرتے تھے، مگر جدید شاعر کے لیے یہ مظاہر توانائی، حرکت اور ارتقا کی علامت بن گئے۔ مثلاً روشنی اب صرف حسن کی دلیل نہیں بلکہ بصیرت اور دریافت کی علامت بھی ہے۔ اسی طرح ''ایٹم'' یا ''ذرہ'' جدید شاعری میں محض مادی اکائی نہیں بلکہ کائناتی وحدت کی تمثیل بن جاتا ہے۔ اقبال کے یہاں ذرہ اور کائنات کا تعلق ایک سائنسی اور روحانی فلسفے کے امتزاج کے طور پر ظاہر ہوتا ہے، جہاں کائنات مسلسل ''حرکت'' میں ہے۔ ن۔م۔راشد کی نظموں میں روشنی، توانائی اور زمان و مکاں کے تصورات سائنسی اور علامتی دونوں سطحوں پر کام کرتے ہیں۔ یوں علمِ سائنس نے ادبی اظہار کی علامتی ساخت کو نہ صرف وسعت دی بلکہ اسے فکری گہرائی بھی عطا کی۔

ادب اور سائنس کا تعلق محض عقل و احساس کے درمیان فاصلہ

مٹانے کا نہیں بلکہ ایک توازن پیدا کرنے کا ہے۔ سائنس انسان کو کائنات کے قوانین سمجھنے میں مدد دیتی ہے، جبکہ ادب ان قوانین کے درمیان انسانی تجربے کی معنویت تلاش کرتا ہے۔ سائنس میں حقائق جامد نہیں بلکہ تجرباتی ہوتے ہیں، اور ادب انہیں انسانی احساس کے قالب میں ڈھالتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں کا اشتراک انسانی تمدن کی روح ہے۔ اردو ادب میں یہ توازن سرسید، اقبال، حالی، اور فیض جیسے ادیبوں کے ہاں جاندار شکل میں دکھائی دیتا ہے۔ وہ سائنس کو محض آلات اور تجربے تک محدود نہیں رکھتے بلکہ اسے اخلاقی اور جمالیاتی قدر کے طور پر دیکھتے ہیں۔ آج بھی ادب کو سائنس کے ساتھ ہم آہنگ ہونا ہے، مگر اپنی جمالیاتی خودمختاری برقرار رکھتے ہوئے؛ یہی وہ نقطہ ہے جہاں ادب اپنا کردار ادا کرتا ہے اور سائنس اپنا۔

سائنس نے فلسفے اور ادب کو یہ سکھایا کہ انسانی شعور جامد نہیں بلکہ ارتقائی ہے۔ آج علمِ حیاتیات سے لے کر نفسیات تک، ہر شاخ یہ اشارہ دیتی ہے کہ انسان اپنے رویوں، احساسات اور فکر میں مسلسل تغیر کے عمل سے گزر رہا ہے۔ ادب اسی تغیر کی تخلیقی زبان ہے۔ مثلاً جہاں سائنس انسان کے دماغ کو ایک حیاتیاتی نظام کے طور پر دیکھتی ہے، ادب اس شعور سے پیدا ہونے والے تصورات کو معنی دیتا ہے۔ اردو ادب نے اس تجربے کو بڑی گہرائی سے محسوس کیا ہے۔ فیض، اقبال، اور راشد جیسے شعرا نے انسانی شعور کو مادی دنیا کے ساتھ باندھ کر ایک ایسا فہم پیدا کیا جو نہ صرف فکری بلکہ روحانی توازن رکھتا ہے۔ یہ فہم آج کے دور میں احیائے انسانیت کے لیے ناگزیر ہے، کیونکہ جدید سائنس نے اگرچہ ترقی دی ہے مگر انسان کے اندر پھیلتی خالی جگہ کو ادب ہی بھر سکتا ہے۔

سائنس کی تیزی سے بڑھتی ترقی نے اخلاقی سوالات کو جنم دیا ہے۔ ایٹم بم کی تخلیق، مصنوعی ذہانت کی خودمختاری، جینیاتی ترمیم، اور ڈیجیٹل نگرانی جیسے مسائل نے انسان کو یہ سوچنے پر مجبور کیا ہے کہ علم اگر ضمیر کے بغیر ہو تو تباہی بھی لا سکتا ہے۔ اس پس منظر میں ادب کا کردار ایک اخلاقی رہنما کا ہے۔ اردو ادب نے ہمیشہ سماجی انصاف، انسان دوستی، مساوات اور انسانی قدروں کی پاسداری کا درس دیا ہے۔ اب یہی قدریں سائنسی ترقی کے لیے بھی ضروری ہیں۔ ادب سائنس سے یہ سوال پوچھنے کی جرات رکھتا ہے کہ "کیا علم انسان کے حق میں ہے؟"، اور یہی سوال علم کی سمت متعین کرتا ہے۔ جب سائنس اخلاق کے تابع ہوگی اور ادب عقل کے ساتھ شریکِ گفتگو، تب ایک متوازن انسانی تہذیب ممکن ہوگی۔ اردو ادب اس فکری ہم آہنگی کا بہترین ذریعہ ہے، کیونکہ اس کی بنیاد ہی انسانی مساوات اور روحانیت پر ہے۔

اردو زبان کی وسعت اور تاریخ اسے ایک زندہ علمی زبان بناتی ہے۔ یہ زبان فارسی اور عربی فلسفے، ہندی تہذیب اور مغربی سائنسی شعور کے تجربات کو یکجا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ آج جب دنیا ایک کثیر لسانی اور بین الثقافتی علم کے دور میں داخل ہو چکی ہے، اردو کا کردار اور بھی اہم ہو جاتا ہے۔ ہندوستان، پاکستان، خلیج، برطانیہ اور امریکہ میں اردو بولنے والوں کے علمی و ادبی ادارے اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اردو محض ماضی کی زبان نہیں، بلکہ مستقبل کی بھی زبان ہے۔ سائنسی محفلوں، کانفرنسوں اور تعلیمی نصاب میں اردو کی موجودگی اس بات کی علامت ہے کہ یہ زبان علم کو جذب کرنے کی مکمل صلاحیت رکھتی ہے۔ ترجمہ، تدریس اور ڈیجیٹل ٹولز کے ذریعے اردو میں سائنسی اصطلاحات کا فروغ تیزی سے جاری ہے۔ اس عمل نے ادب اور سائنس دونوں کو ایک دوسرے کا ہمنوا بنا دیا ہے۔

آنے والے زمانے میں ادب اور سائنس کا اتحاد محض خیال نہیں بلکہ ضرورت بن جائے گا۔ دنیا ایک ایسے دور میں داخل ہو رہی ہے جہاں مصنوعی ذہانت، خودکار نظام اور بایو سائنس انسانی وجود کے سوالات بدل رہے ہیں۔ اردو ادب اس تغیر کے ساتھ چلنے کا حوصلہ رکھتا ہے، بشرطیکہ ہم اپنے تخلیقی شعور کو سائنسی بصیرت کے ساتھ ہم آہنگ کریں۔ مستقبل کے ادیب کو لیبارٹری کے سائنس دان کی طرح دنیا کے رازوں کی کھوج میں مصروف ہونا ہوگا، اور سائنس دان کو شاعر کی طرح اپنے علم کی اخلاقی و انسانی معنویت پر غور کرنا ہوگا۔ اس میل جول سے ہی ایک ایسا فکری نظام وجود میں

آئے گا جس میں دلیل، تخیل، اخلاق اور تخلیق سب ایک ساتھ سانس لیتے ہوں گے۔ اردو زبان چونکہ جذب و اظہار کی دونوں استعداد رکھتی ہے، اس لیے یہ نئے انسانی تہذیبی دور کی نمائندہ زبان بن سکتی ہے۔

اردو زبان آج دنیا کے مختلف حصوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ مشرقِ وسطیٰ، یورپ، امریکہ، افریقہ، اور وسطی ایشیا میں اردو زبان کے ادارے، ریڈیو اسٹیشن، اور تحقیقی مراکز قائم ہیں۔ ان اداروں میں سائنسی مباحث کے ساتھ اردو ادب کو پڑھایا جا رہا ہے۔ برطانیہ اور کینیڈا کی جامعات میں ''اردو لسانیات اور سائنسی ترجمہ'' کے کورسز متعارف کرائے گئے ہیں۔ یہ رجحان ثابت کرتا ہے کہ اردو اب محض تہذیبی روایت نہیں بلکہ عالمی علمی گفتگو کا حصہ ہے۔ سوشل میڈیا اور اردو ویب سائٹس نے علم و ادب کے درمیان حائل فاصلوں کو کم کر دیا ہے۔ دنیا کے مختلف ممالک میں اردو بولنے والی کمیونیٹی سائنسی مکالمہ اردو میں کر رہی ہیں گویا اردو زبان علمِ سائنس کے لیے ایک قابلِ عمل اظہار بن چکی ہے۔ یہ ادبی و سائنسی میل جول ثقافتی شناخت کو برقرار رکھتے ہوئے ایک کثیر لسانی دنیا کی تشکیل میں معاون ہے۔

مستقبل میں اردو ادب کے لیے سائنس صرف ایک موضوع نہیں رہے گی، بلکہ اظہار اور تخلیق کا ایک نیا زاویہ بنے گی۔ مصنوعی ذہانت، ڈیجیٹل انسان، بایو اخلاقیات، اور ماحولیات کی بحرانی صورتیں اردو کے ادیب کے لیے نئے علامتی ذرائع فراہم کر سکتی ہیں۔ ادب کا مقصد ہمیشہ انسان کو خود اس کے آئینے میں دیکھنا رہا ہے، اور اب سائنس نے یہ آئینہ ٹیکنالوجی کی صورت میں مزید واضح کر دیا ہے۔ اردو شاعر اور افسانہ نگار اب ''علمی تخیل'' کے ذریعے سائنس کو انسانی قدروں کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مستقبل کا اردو ادب شاید لیبارٹری اور تخلیق کے سنگم پر کھڑا ہوگا، جہاں ''شاعر'' اور ''سائنس دان'' دونوں ایک ہی سوال کے دو زاویے ہوں گے: انسان آخر ہے کیا؟ اردو کی لچک دار ساخت اور فلسفیانہ روایت اسے اس گفتگو کے لیے نہایت موزوں بناتی ہے۔

آخر میں یہ کہنا بجا ہے کہ ادب اور سائنس ایک ہی انسانی ذہن کی دو متوازن جہتیں ہیں ۔ ایک مشاہدے کی قوت دیتی ہے، دوسری معنی کی۔ اگر سائنس انسانی بدن کو سمجھنے کا علم ہے تو ادب اس بدن میں روح کے معنی تلاش کرتا ہے۔ اردو ادب نے ہمیشہ علم و دانش، احساس و وجدان، اور عقل و تخیل کے درمیان پل کا کردار ادا کیا ہے۔ آج جب دنیا تیز رفتاری، مشینی ترقی اور مادی ترجیحات میں الجھ چکی ہے، اردو ادب اپنی فکری وسعت اور جذباتی صداقت کے ذریعے انسان کو پھر یاد دلا سکتا ہے کہ علم کا اصل مقصد انسان کی فلاح ہے، تباہی نہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ادب اور سائنس ایک دوسرے کے مددگار بنتے ہیں۔ چنانچہ اردو ادب میں سائنسی تصورات کی پیشکش محض ایک ادبی رجحان نہیں بلکہ ایک فکری جہت ہے جو آنے والے زمانوں میں انسانی شعور کی نئی منزلوں کی سمت رہنمائی کرے گی۔

❒❖❒

ماخذ و مصادر

- ☆ ادب اور سائنس، مرتب جمال نقوی، سنہ 1998
- ☆ اردو میں سائنسی و تکنیکی ادب، محمد شکیل خاں، سنہ 1988
- ☆ اردو میں سائنس ادب قدیم ترین کارنامے، خواجہ حمید الدین شاہد، سنہ 1957
- ☆ اردو میں بچوں کا سائنسی ادب ایک مطالعہ، محمد رضا، مشمولہ: اردو ریسرچ جرنل، شمارہ مارچ 2017
- ☆ اردو میں سائنسی ادب اور عصری تقاضے: محمد افروز عالم، مشمولہ اردو دنیا، ستمبر 2022
- ☆ سائنس اور ادب کے باہمی روابط واشتراکات، ڈاکٹر قاضی عابد، عمران اختر، مشمولہ: ششماہی خیابان، سنہ 2010

❒❖❒

Dr. Syeda Naziya Fatema
Department of Urdu
Dr. Baba Saheb Ambedkar Marathwada
Bhasha Bhawan,
Chhatrapati Sambhajinagar-431001 (M.S)

ایم ریحانہ پروین

صادقہ نواب سحر
کی نظموں میں نسائی شعور کی تشکیل

اردو ادب کی معاصر فضا میں صادقہ نواب سحر ایک ایسی توانا اور معتبر آواز کے طور پر سامنے آتی ہیں جن کی نظم نگاری فکری گہرائی، تہذیبی شعور اور نسائی احساس کی لطیف آمیزش سے تشکیل پاتی ہے۔ ان کی شاعری محض جذبات کے اظہار تک محدود نہیں بلکہ سماج، فرد اور عصرِ حاضر کے پیچیدہ مسائل پر سنجیدہ مکالمہ قائم کرتی ہے۔ صادقہ نواب سحر صاحبہ کی نظموں میں عورت کی داخلی دنیا، اس کی شناخت، اس کے وجود پر سوالات اور سماجی جبر کے خلاف خاموش مگر موثر احتجاج نمایاں طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔

ان کی نظم نگاری کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ روایت اور جدیدیت کے درمیان ایک متوازن راستہ اختیار کرتی ہیں۔ ایک طرف کلاسیکی شعری اقدار اور زبان کی شائستگی موجود ہے تو دوسری جانب جدید حسیت، علامتی اظہار اور عصری شعور پورے آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ وہ ذاتی تجربات کو اجتماعی شعور سے اس طرح جوڑتی ہیں کہ نظم ایک فرد کی کہانی سے نکل کر پورے سماج کی آواز بن جاتی ہے۔ میں اپنے اس مضمون کے تحت آپ کی نظم نگاری کے فکری، فنی اور موضوعاتی پہلوؤں کا تفصیلی جائزہ پیش کرنے کے ساتھ ہی اس بات کی بھی وضاحت کرنا چاہتی ہوں کہ ان کی نظمیں معاصر اردو نظم کو نہ صرف معنوی وسعت عطا کرتی ہیں بلکہ قاری کو فکر و احساس کی نئی جہات سے بھی روشناس کراتی ہیں۔

نسائی شعور سے مراد وہ فکری اور تہذیبی آگہی ہے جو عورت کو ایک خود مختار وجود کے طور پر پہچاننے، اس کے سماجی، معاشی، نفسیاتی اور ثقافتی مسائل کو سمجھنے اور ان کے اظہار کا شعوری حق فراہم کرتی ہیں۔ یہ شعور عورت کو محض جذبات یا رشتوں کی علامت کے بجائے ایک باشعور فرد کے طور پر سامنے لاتا ہے جو اپنے وجود، شناخت اور آزادی کے بارے میں سوال اٹھانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ نسائی شعور دراصل پدرشاہی نظام کے تحت قائم سماجی ڈھانچوں پر تنقیدی نظر ڈالنے اور عورت کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں، جبر اور امتیاز کو فکری سطح پر چیلنج کرنے کا نام ہے۔

اردو ادب میں نسائی شعور کا ارتقاء بتدریج ہوا ہے۔ ابتدائی دور میں عورت کی تصویر زیادہ تر مردانہ نقطۂ نظر کے تحت پیش کی گئی، جہاں وہ حسن، وفا، ایثار اور قربانی کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، بالخصوص انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں، سماجی اصلاحی تحریکوں، تعلیم کے فروغ اور عورتوں کی عملی شرکت نے نسائی شعور کو نئی سمت عطا کی۔ رشید جہاں، عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر جیسی ادیباؤں نے عورت کی داخلی دنیا، اس کی خواہشات، الجھنوں اور سماجی بندشوں کو جرات مندانہ انداز میں ادب کا حصہ بنایا، جس سے اردو ادب میں نسائی شعور ایک مضبوط فکری روایت کے طور پر ابھر کر سامنے آیا۔

سحر صاحبہ کے عہد میں نسائی شعور کو فیمینزم کی مختلف نظریاتی جہتوں کے تناظر میں سمجھا جا سکتا ہے۔ اس دور میں فیمینزم محض صنفی مساوات کے مطالبے تک محدود نہیں رہا بلکہ عورت کی شناخت، جسم، زبان، تجربے اور اختیار جیسے موضوعات کو بھی مرکزِ بحث بنایا گیا۔ اس زمانے کی نسائی شاعری میں عورت کا لہجہ احتجاجی بھی ہے اور خود آگہی سے بھرپور بھی۔ وہ اپنی ذات کے گرد قائم سماجی پابندیوں پر سوال اٹھاتی ہے اور اپنے داخلی کرب، تنہائی، محبت، شکست اور مزاحمت کو شعری اظہار میں ڈھالتی ہے۔ اس عہد کا نسائی شعور نہ صرف سماجی جبر کی نشان دہی کرتا ہے بلکہ عورت کے اندر موجود قوتِ مزاحمت اور خود اعتمادی کو بھی اجاگر کرتا ہے۔

سحر صاحبہ کی شاعری اسی تناظر میں نسائی شعور کی ایک بامعنی مثال کے طور پر سامنے آتی ہے۔ ان کی شاعری میں عورت محض مظلوم کردار نہیں بلکہ ایک حساس، باشعور اور سوال کرنے والا وجود ہے جو اپنی شناخت کی تلاش میں سرگرداں نظر آتا ہے۔ سحر صاحبہ کا نسائی شعور جذباتیت سے آگے بڑھ کر فکری پختگی اختیار کرتا ہے، جہاں عورت اپنے تجربات کو اجتماعی نسائی احساس میں ڈھال دیتی ہے۔ یہی تناظر موصوفہ کی شاعری کے تجزیے کی بنیاد فراہم کرے گا، جس کے ذریعے ان کے کلام میں موجود نسائی شعور کے مختلف پہلو، فکری جہات اور سماجی معنویت واضح ہوتی ہے۔ ان کی نظم عورت کے اندر چھپے ہوئے دکھ، اس کی تنہائی، اس کی قربانی اور اس کی ناقدری کا شدت سے احساس دلاتی ہے۔ ان کے پہلے شعری مجموعے ''انگاروں کے پھول'' سے یہ نظم بہ عنوان ''ہم روئیں کب'' ملاحظہ فرمائیں:

سب کو ہنسا کر خوش ہوتے ہیں
یہ بتلا ہم روئیں کب
سپنے بنتے بنتے آنکھیں تھک جاتی ہیں
بکھری زلفیں، بھیگی آنکھیں
غم کی مورت بن جاتی ہے
من ہی من میں تجھ کو پوجا
لیکن ہم نے کیا پایا
تجھ کو اپنا سب کچھ سمجھا
لیکن ہم نے کیا پایا
گیت سنایا ہم نے وہی
تیرے دل کو جو بھایا
پھر بھی سنا ہے
تو ہے خفا
ہائے وفا
تیرے کاندھے پر سر رکھ کے
یہ بتلا ہم روئیں کب 1

عورت صدیوں سے محبت، قربانی اور ایثار کی علامت بن کر دوسروں کی زندگی میں خوشیوں کے چراغ جلاتی آئی ہے۔ وہ کبھی ماں بن کر ممتا کی چھاؤں دیتی ہے، کبھی بیٹی بن کر امیدوں کی کرن بنتی ہے اور کبھی شریکِ حیات بن کر زندگی کے نشیب و فراز میں ساتھ نبھاتی ہے۔ مگر اس سب کے دوران وہ اکثر اپنی ذات کو پسِ

پشت ڈال دیتی ہے۔ وہ سب کو ہنسانے، سب کا بوجھ بانٹنے اور ہر رشتے کو جوڑے رکھنے میں اس قدر مگن رہتی ہے کہ اس کے اپنے دکھ اس کے دل ہی میں دفن ہو جاتے ہیں۔

موصوفہ جب خود کلامی کے انداز میں یہ سوال اٹھاتی ہے: ''یہ بتلا ہم روئیں کب؟'' تو یہ صرف ایک سوال نہیں رہتا بلکہ عورت کی صدیوں پر پھیلی ہوئی خاموش چیخ بن جاتی ہے۔ گویا وہ کہہ رہی ہو کہ ہم نے ہمیشہ دوسروں کے آنسو پونچھے، مگر ہمارے آنسو دیکھنے والا کون ہے؟ ہمیں ہمیشہ مضبوط رہنے کا مشورہ دیا گیا، مگر ہماری کمزوریوں کو سمجھنے والا کوئی نہ تھا۔

ان کی نظمیں کسی خیالی دنیا کی نہیں بلکہ عام زندگی کی کہانی سناتی ہیں۔ ان کی نظموں میں عورت کی بنیادی ضرورتیں، اس کے دل کا کرب، اس کی ان کہی خواہشیں اور روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے مسائل نہایت سادگی مگر گہرائی کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قاری جب ان نظموں کو پڑھتا ہے تو اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ کہانی کسی اور کی نہیں بلکہ اس کی اپنی یا اس کے اردگرد موجود کسی عورت کی ہے۔ اس تخلیقی اظہار میں دکھ بھی ہے، شکوہ بھی، مگر اس کے ساتھ ایک خاموش حوصلہ اور امید کی کرن بھی جھلکتی ہے جو عورت کی اصل طاقت کی علامت بن جاتی ہے۔ پروفیسر میر تراب علی کے قول سے اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کی تخلیقات ظلم کرنے والوں اور نا انصافی کو اپنی عادت بنانے والوں کے ہاتھوں بچے ہوئے حسن اور خوبصورتی کے اثاثہ کی حفاظت سے عبارت ہے۔ ان کی تحریریں علم و آگہی فہم و ادراک محسوسات اور تفکرات کی آئینہ دار ہیں۔''2

صادقہ نواب سحر صاحبہ اپنی شاعری میں علامتوں اور استعاروں کا استعمال بھی کرتی ہیں، مگر یہ علامتیں پیچیدہ نہیں ہوتیں بلکہ قاری کے لیے آسان اور قابلِ فہم ہوتی ہیں۔ ان کی نظموں میں جذبات کی سچائی اور تجربات کی صداقت قاری کے دل کو چھو لیتی ہے۔ وہ بلند آہنگ نعروں یا جذباتی مبالغے کے بجائے دھیمے، سنجیدہ اور باوقار لہجے میں بات کرتی ہیں، جو ان کی شاعری کو مزید موثر بنا دیتا ہے۔

موکش

تمھاری خاموشی
مجھے طرح طرح کی داستانیں سناتی ہیں
یہ الفاظ کہاں سے شروع ہوتے ہیں
کہاں ختم ہو جاتے ہیں۔ مجھے سب پتہ ہے۔
مگر ایسا کیوz ہے کہ
الفاظ کے خاتمے میں بھی
میرا کوئی موکش نہیں!
مجھے موکش نہیں!

(موکش: نجات)

سحر صاحبہ کی نظم نگاری کا اندازِ بیان سادہ، دردمند، حقیقت پسندانہ، نسائی شعور سے بھرپور اور سماجی مسائل کا ترجمان ہے۔ ان کی نظموں میں زندگی کی تلخ حقیقتیں بھی ہیں اور انسان دوستی کا نرم جذبہ بھی، اور یہی بات ان کو معاصر شعراء میں ایک منفرد مقام عطا کرتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کی ایک نظم ''دنیا کھیل تماشہ'' دیکھیے جو شعری مجموعہ ''ست رنگی'' میں شامل ہے۔ انھوں نے اس نظم میں غریب اور محروم عورتوں کی زندگی کا نہایت ہی مؤثر اور درد انگیز نقشہ کھینچا ہے۔ موصوفہ نے نہایت ہی سادگی، سچائی اور گہرے احساس کے ساتھ ان کی روزمرہ زندگی کے مناظر کو اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری خود کو ان کے دکھ سکھ کے قریب محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس نظم میں یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ان عورتوں کو جیسی بھی زندگی میسر آئی ہے، انھوں نے اسے صبر، حوصلہ اور قناعت کے ساتھ قبول کر لیا ہے اور اپنی محدود دنیا میں مگن رہ کر زندگی گزار رہی ہیں۔3

انھیں اس بات سے کوئی خاص غرض نہیں کہ معاشرہ ان کے وجود اور ان کی زندگی کو محض ایک تماشہ سمجھے یا حقارت کی نگاہ سے دیکھے۔ وہ اپنے حال پر راضی ہیں اور اپنی تقدیر کے ساتھ سمجھوتا کر چکی ہیں۔ موجودہ دور میں کسی دوسرے انسان، خصوصاً کمزور اور محروم طبقے کے

بارے میں ہمدردی، دردمندی اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ سوچنا دراصل انسانیت کی اعلیٰ اور بلند ترین اقدار میں شمار ہوتا ہے۔

سحر صاحبہ اپنی تخلیقات کے ذریعے عورت کے احساسات اور جذبات میں ایک نیا رنگ اور ایک نئی امنگ پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ جس سے عورت میں ایک نئی امید اجاگر ہوتی ہے:

ہم دل کے زخم کس کو دکھائیں ، بتایئے؟

محفل نہیں رہی، وہ ترانے نہیں رہے
دیوانگی کے اب تو زمانے نہیں رہے
بلبل نہیں چمن میں، دِوانے نہیں رہے

اب جو بھی فیصلہ کرو ہم کو قبول ہے
تم جانتے ہو دل مرا کتنا ملول ہے
ناراض دوستوں کو منانا فضول ہے
اب دوستی کی لاش اُٹھانا فضول ہے

اپنے لہو سے آپ ہی ہولی منایئے
کیوں اپنے دل کے زخم کسی کو دکھایئے

فنونِ لطیفہ کے ہر شعبے میں ہمیں اس انسانی ہمدردی اور سماجی شعور کی جھلک دکھائی دیتی ہے، مگر شاعری میں یہ اثر کچھ زیادہ ہی گہرا اور دیرپا ہوتا ہے۔ شاعری میں خیالات اور جذبات ایک منظّم، مربوط اور دل نشین انداز میں ڈھل کر سامنے آتے ہیں، اور اس میں ایسی کشش اور تاثیر ہوتی ہے جو قاری کے دل و دماغ پر گہرا اثر چھوڑتی ہے اور اسے سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

باوجود

مرا سوال دوسرا تھا تم نے کیا سمجھ لیا
میں آرزو کے محل کی مسحور اک پری سی تھی،
جس کی چال میں لچک تھی، جس کے ہونٹ پہ ہنسی......
تم آرزو کے محل کی دیوار سے لگے ہوئے،
کھڑے تھے میری زندگی کی ڈور سے جڑے ہوئے
میں آنکھ بھر کے دیکھتی تمھیں،
تو پوچھتی کہ تم نے ڈور کیوں ہے تھام لی۔
مگر نظر جو آئے تم تو آنکھ کب اُٹھی مری......؟
جھکی نظر سے میں نے یہ کہا کہ میں وجود ہوں
تمھاری زندگی کی الجھنوں کے باوجود ہوں

میں آرزو کے محل کی مسحور اک پری سی تھی
تمھارے لوہے کے محل کی زنگ سے بھری ہوئی،
رنگ کا غلاف اوڑھے شان سے تنی ہوئی
گلی میں مجھ کو چھوڑ کر
وجود کی تلاش میں نکل نہ جاؤ تم کہیں......!

موصوفہ کی نظموں میں جہاں خودنوشت کی جھلک نظر آتی ہے، وہیں اجتماعی زندگی کی کہانی بھی پوری شدت کے ساتھ ابھر کر سامنے آتی ہے، بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ یہ نظمیں ذات اور کائنات، فرد اور سماج کے حسین امتزاج سے جنم لیتی ہیں اور ’’ہم بیتی‘‘ کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ سحر صاحبہ کا حساس شعور، بیدار فکر، تیز نگاہ اور خیالوں کا بے کراں سمندر اس قدر موجزن اور بے قرار ہے کہ بعض اوقات وہ اپنے جذبات کو ضبط میں نہیں رکھ پاتیں اور وہ خود بخود نظم کے قالب میں ڈھل کر صفحہ قرطاس پر بکھر جاتے ہیں۔ ان نظموں میں ایک ایسی عورت کا عکس نمایاں ہے جو ایک طرف بیوی بھی ہے، اور دوسری طرف مرد اساس سماج کے جبر، ناانصافی اور دوہرے معیار کے خلاف احتجاج بھی کرتی ہے۔ وہ اپنے تعلیم یافتہ شوہر کے محبت بھرے اور خوش رنگ حصار میں بھی ہے، مگر ساتھ ہی وہ ایک باوقار، خوددار اور باصلاحیت نوجوان خاتون بھی ہے جسے معاشرے کی نگاہوں کا مسلسل سامنا رہتا ہے۔ ایسے ماحول میں جینا، سماج کے بیچ رہ کر اپنے وقار اور خودداری کو پوری آب و تاب کے ساتھ قائم رکھنا، ایک تعلیم یافتہ اور ملازمت پیشہ عورت کے لیے کسی کڑے امتحان سے کم نہیں۔ تاہم صادقہ

نواب سحر صاحبہ اس آزمائش میں سرخرو نظر آتی ہیں کہ انھوں نے اپنی حدود و قیود کو پہچان لیا ہے اور اپنے مکان کو حقیقی معنوں میں جنت نظیر گھر میں بدل دیا ہے۔ وہ اپنی اس چھوٹی سی جنت میں مطمئن اور خوش وخرم زندگی بسر کر رہی ہیں۔ اگر وہ کہیں غمزدہ اور افسردہ دکھائی دیتی ہیں تو اس کا سبب اپنی ہم جنس عورتوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافی، ظلم اور استحصال ہے، جس کے خلاف وہ اپنے قلم کو ہتھیار بنا کر مسلسل جدوجہد کرتی رہتی ہیں۔

ان کی یہ رنگا رنگ اور کثیر جہتی نظمیں نہ صرف ذاتی اور سماجی تجربات کی ترجمانی کرتی ہیں بلکہ موجودہ عالمی مسائل اور عصری حسیت کو بھی بھرپور شعری اظہار عطا کرنے میں کامیاب نظر آتی ہیں۔ انھوں نے اپنی نظموں میں صرف ایک مجبور اور بے بس عورت کی زندگی ہی کو موضوع نہیں بنایا بلکہ انھوں نے عورت کے بچپن، اس کی معصومیت، ابتدائی دکھ، گھریلو ماحول کے اثرات، اور وہ زخم جو بچپن میں لگتے ہیں اور پوری زندگی کا حصہ بن جاتے ہیں ان سب کو بھی بڑی گہرائی اور حساسیت کے ساتھ اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ ان کی نظموں میں ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ عورت کی محرومی اور جدوجہد صرف شادی یا جوانی کے بعد شروع نہیں ہوتی بلکہ اس کی بنیاد بچپن ہی میں رکھ دی جاتی ہے۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعے بتاتی ہیں کہ کس طرح بچپن کے تلخ تجربات ایک لڑکی کی شخصیت، سوچ اور جذبات پر گہرا اثر چھوڑتے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں عورت کی زندگی کو ابتدا سے انجام تک ایک مسلسل جدوجہد، صبر، اور خاموش قربانی کی داستان کے طور پر پیش کیا ہے، جس میں بچپن بھی اتنا ہی اہم اور دردناک مرحلہ ہے جتنا کہ جوانی یا بڑھاپا۔

سحر صاحبہ نے اپنی شاعری میں نظم کی مختلف ہیئتوں کو نہایت کامیابی کے ساتھ برتا ہے۔ انھوں نے پابند نظم، معریٰ نظم، آزاد نظم اور نثری نظم ہر صنف میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ ان کی نظموں میں فنی پختگی کے ساتھ ساتھ فکری گہرائی بھی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ صادقہ نواب سحر نے سماج کے محروم اور پسے ہوئے طبقات، خصوصاً دلت برادری کے مسائل اور دکھ درد کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے ان لوگوں کی زندگی کی تلخیوں، ناانصافیوں اور سماجی ناہمواریوں کو نہایت دردمندی اور حساسیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی نظمیں جیسے اگلی پیڑھی، چمارن گھونگھٹ یوں نہ کھول، اونچے گھر کی دلہن وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، جن میں استحصال زدہ طبقے کی بے بسی، جدوجہد اور امید کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔

مجموعی طور پر یوں کہا جاسکتا ہے کہ صادقہ نواب سحر کی شاعری نہ صرف فنی اعتبار سے متنوع اور مضبوط ہے بلکہ سماجی شعور اور انسانی ہمدردی کی بھرپور ترجمان بھی ہے، جو قاری کے دل و دماغ پر گہرا اثر چھوڑتی ہے۔ ان کی نظموں کے مجموعی مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اردو نظم میں نسائی احساسات، باطنی اذیت، معاشرتی حقیقتوں اور انسانی کیفیات کو نہایت سادہ، پراثر اور سچے انداز میں بیان کرنے میں کامیاب نظر آتی ہیں۔ ان کی شاعری نہ صرف عورت کے درد، جدوجہد اور قربانیوں کی عکاس ہے بلکہ پورے معاشرے کے نازک اور اہم مسائل کا ترجمان بھی ہے۔ ان کے کلام میں زبان کی سلاست، بیان کی صداقت اور جذبے کی گہرائی قاری کے دل و دماغ پر گہرا اور دیرپا نقش چھوڑتی ہے۔ بالآخر صادقہ نواب سحر صاحبہ کی نظم نگاری کا جائزہ لینے کے بعد مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اردو ادب میں ایک توانا، معتبر اور بامعنی آواز کے طور پر اپنی الگ پہچان بنانے میں کامیاب ہیں۔

حوالہ جات

1) انگاروں کے پھول، صادقہ نواب سحر۔ ص۔ 17

2) صادقہ نواب سحر شخصیت اور فن: فکشن کے تناظر میں۔ پروفیسر میر تُراب علی یداللٰہی، محمد اسلم نواب۔ ص۔ 91

3) صادقہ نواب سحر کی شاعری کے تناظر میں۔ ص۔ 85

❒❖❒

M. Reehana Parveen
Research Scholar
Department of Arabic, Parsian and Urdu
Sri Venkateswara University
Tirupati-517502 (A.P)

اسنیٰ سحر

خواتین کی زندگی میں یوگ کی اہمیت

یوگ ایک قدیم جسمانی، ذہنی اور روحانی مشق ہے جس کی ابتدا ہزاروں سال پہلے ہندوستان میں ہوئی۔ آج کے جدید دور میں یوگ پوری دنیا میں صحت مند زندگی گزارنے کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ خواتین کی زندگی مختلف ذمہ داریوں، جذباتی دباؤ اور جسمانی تبدیلیوں سے بھری ہوتی ہے۔ ایسے میں یوگ نہ صرف جسمانی صحت کو بہتر بناتا ہے بلکہ ذہنی سکون، اعتماد اور خوشی بھی فراہم کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج خواتین میں یوگ کا رجحان تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ یوگ کیا ہے؟ یوگ سنسکرت زبان کا لفظ ہے جس کے معنی 'جوڑنا' یا 'اتحاد' کے ہیں۔ اس کا مقصد جسم، دماغ اور روح کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔ یوگ میں مختلف آسن، سانس کی مشقیں اور مراقبہ شامل ہوتے ہیں جو انسان کو صحت مند اور پُرسکون بناتے ہیں۔

خواتین کو زندگی کے مختلف مراحل میں کئی جسمانی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جیسے کمزوری، موٹاپا، ہارمونز کی بے ترتیبی، حمل کے دوران مشکلات اور بڑھتی عمر کے اثرات۔ یوگ ان تمام مسائل کے حل میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ مندرجہ ذیل نکات کے ذریعے خواتین کی زندگی میں یوگ کی اہمیت کو واضح کیا جا سکتا ہے:

1۔ جسم کو مضبوط اور متوازن بنانا

خواتین کی زندگی مسلسل جسمانی محنت، ذہنی دباؤ اور مختلف ذمہ داریوں سے بھرپور ہوتی ہے۔ گھر، ملازمت، بچوں کی پرورش اور معاشرتی فرائض کے درمیان اکثر خواتین اپنی صحت کو نظر انداز کر دیتی ہیں۔ اس کا نتیجہ کمزوری، تھکن، موٹاپا، کمر درد اور جسمانی عدم توازن کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ ایسے حالات میں یوگ ایک قدرتی اور موثر طریقہ ہے جو خواتین کے جسم کو نہ صرف مضبوط بناتا ہے بلکہ اسے متوازن، لچکدار اور صحت مند بھی رکھتا ہے۔

یوگ جسمانی ورزش کے ساتھ ساتھ ذہنی سکون اور اندرونی طاقت پیدا کرنے کا ذریعہ بھی ہے۔ اس کی باقاعدہ مشق خواتین کے جسم کے ہر حصے پر مثبت اثر ڈالتی ہے۔ یوگ میں شامل مختلف آسن اور سانس کی مشقیں جسم کے پٹھوں، ہڈیوں اور اعصاب کو مضبوط کرتی ہیں، جس سے جسمانی طاقت اور برداشت میں اضافہ ہوتا ہے۔ یوگ کی باقاعدہ مشق جسم کے پٹھوں کو مضبوط بناتی ہے جس کی وجہ سے جسم میں لچک پیدا ہوتی ہے اور تھکن کم محسوس ہوتی ہے۔ اس طرح خواتین روزمرہ کے کام آسانی سے انجام دے سکتی ہیں۔ یوگ کے مختلف آسن جسم کو نرم اور لچکدار بناتے ہیں۔ جب جسم میں لچک بڑھتی ہے تو پٹھوں میں کھنچاؤ کم ہوتا ہے اور حرکت کرنے میں آسانی پیدا ہوتی ہے۔ خاص طور پر بازوؤں، ٹانگوں، کمر اور پیٹ کے عضلات مضبوط ہوتے ہیں۔ روزانہ یوگ کرنے والی خواتین زیادہ متحرک، توانا اور چست محسوس کرتی ہیں۔ بہت سی خواتین مستقل کمزوری اور جلد تھک جانے کی شکایت کرتی ہیں۔ یوگ خون کی روانی کو بہتر بناتا ہے جس سے جسم کے ہر حصے کو مناسب مقدار میں آکسیجن اور غذائیت ملتی ہے۔ اس سے جسمانی توانائی

بڑھتی ہے اور تھکن کم محسوس ہوتی ہے۔

یوگ جسمانی توازن کو بھی بہتر بناتا ہے۔ بعض خواتین کو چلتے وقت یا کام کرتے ہوئے جسمانی عدم توازن کا سامنا ہوتا ہے، خاص طور پر بڑھتی عمر میں۔ یوگ کے توازن والے آسن جسم کے اعصابی نظام کو مضبوط کرتے ہیں اور جسم کے مختلف حصوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں۔ عورتوں میں کیلشیم کی کمی کے سبب ہڈیوں کی کمزوری ایک عام مسئلہ ہے، خاص طور پر عمر بڑھنے کے بعد۔ یوگ ہڈیوں کو مضبوط بنانے میں مدد دیتا ہے کیونکہ اس کی مشق سے جسم کے مختلف حصوں پر متوازن دباؤ پڑتا ہے جو ہڈیوں کو طاقت دیتا ہے۔ اسی طرح جوڑوں کے درد، گھٹنوں کی تکلیف اور کمر درد میں بھی یوگ مفید ثابت ہوتا ہے۔ نرم اور متوازن حرکات جوڑوں کو فعال رکھتی ہیں اور ان میں اکڑاؤ پیدا نہیں ہونے دیتیں۔

2۔ وزن کم کرنے میں مددگار

موجودہ دور میں خواتین کے لیے بڑھتا ہوا وزن ایک اہم مسئلہ بن چکا ہے۔ غیر متوازن غذا، جسمانی سرگرمیوں کی کمی، ذہنی دباؤ اور مصروف طرزِ زندگی کی وجہ سے بہت سی خواتین موٹاپے کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اضافی وزن نہ صرف جسمانی خوبصورتی کو متاثر کرتا ہے بلکہ کئی بیماریوں کا سبب بھی بنتا ہے، جیسے ذیابیطس، ہائی بلڈ پریشر، دل کی بیماریاں اور جوڑوں کا درد وغیرہ۔ آج بہت سی خواتین موٹاپے کی وجہ سے پریشان رہتی ہیں۔ ایسے حالات میں یوگ ایک قدرتی، محفوظ اور موثر طریقہ ہے جو خواتین کو وزن کم کرنے اور صحت مند زندگی گزارنے میں مدد دیتا ہے۔ یوگ صرف ایک ورزش نہیں بلکہ ایک مکمل طرزِ زندگی ہے۔ اس میں جسمانی حرکات، سانس کی مشقیں اور ذہنی سکون شامل ہوتے ہیں جو جسم اور دماغ دونوں پر مثبت اثر ڈالتے ہیں۔ خواتین اگر باقاعدگی سے یوگ کریں تو وہ نہ صرف اپنا وزن کم کر سکتی ہیں بلکہ جسمانی اور ذہنی طور پر بھی خود کو بہتر محسوس کرتی ہیں۔ موٹاپا نہ صرف جسمانی بیماریوں کا سبب بنتا ہے بلکہ خوداعتمادی پر بھی اثر ڈالتا ہے۔ یوگ جسم میں چربی کم کرنے اور میٹابولزم بہتر بنانے میں مدد دیتا ہے۔ اس سے وزن متوازن رہتا ہے اور جسم خوبصورت دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یوگ جسمانی خوبصورتی میں بھی اضافہ کرنے میں اپنا فعال کردار ادا کرتا ہے۔ اس سے چہرے پر تازگی آتی ہے، جلد بہتر ہوتی ہے اور جسم متوازن دکھائی دیتا ہے۔ ایک صحت مند جسم خواتین کو پراعتماد بناتا ہے۔

خواتین میں ہارمونز کی تبدیلی بھی وزن بڑھنے کی ایک بڑی وجہ ہوتی ہے، خاص طور پر حمل، زچگی یا بڑھتی عمر کے دوران۔ یوگ ہارمونل نظام کو متوازن رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ اس سے جسم کے اندرونی نظام بہتر انداز میں کام کرتے ہیں اور وزن قابو میں رہتا ہے۔ بہت سی خواتین پیٹ کی چربی بڑھنے کی شکایت کرتی ہیں۔ یوگ جسم میں موجود اضافی چربی کو کم کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ مختلف یوگ آسن جسم کے مخصوص حصوں پر اثر انداز

ہوتے ہیں، جیسے پیٹ، رانیں، بازو اور کمر۔ یوگ کے مختلف آسن جسم میں کیلوریز جلانے میں مدد دیتے ہیں اور چربی کو آہستہ آہستہ کم کرتے ہیں۔مثلاً سوریا نمسکار، پرانایام، بھوجنگ آسن ، نوک آسن، تریکون آسن، پون مکت آسن، کپال بھاتی۔یہ آسن جسم میں چربی کم کرنے، ہاضمہ بہتر بنانے اور جسم کو متحرک رکھنے میں مدد دیتے ہیں۔یوگ کی باقاعدہ مشق پیٹ کے عضلات کو مضبوط کرتی ہے اور اضافی چربی کم کرنے میں مدد فراہم کرتی ہے۔اس سے جسم متناسب اور خوبصورت دکھائی دیتا ہے۔

چونکہ وزن کم کرنے میں جسم کے میٹابولزم کا اہم کردار ہوتا ہے۔ اگر میٹابولزم سست ہو تو جسم میں چربی زیادہ جمع ہونے لگتی ہے۔ یوگ جسم کے نظام کو متحرک کرتا ہے اور میٹابولزم کو بہتر بناتا ہے، جس سے غذا بہتر طریقے سے ہضم ہوتی ہے اور فوراً توانائی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔جب جسم کا نظام درست انداز میں کام کرتا ہے تو وزن متوازن رہتا ہے اور موٹاپے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں اور اسی نظام کو بہتر کرنے میں یوگ کام کرتا ہے۔

3۔ذہنی دباؤ میں کمی

آج کی مصروف زندگی میں خواتین گھریلو اور معاشرتی ذمہ داریوں کی وجہ سے ذہنی دباؤ کا شکار رہتی ہیں۔ یوگ ذہنی سکون حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔یوگ سانس کی مشقوں اور مراقبے کے ذریعے ذہن کو پرسکون کرتا ہے۔اس سے تناؤ، پریشانی اور ڈپریشن کم ہوتا ہے۔

یوگ نہ صرف ذہنی آسودگی کا ذریعہ بنتا ہے بلکہ ذہنی اور جسمانی ہم آہنگی فراہم کرنے میں مددگار ثابت ہے۔یوگ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ جسم اور دماغ دونوں کو ایک ساتھ مضبوط کرتا ہے۔جب ذہن پُرسکون ہوتا ہے تو جسم بھی بہتر طریقے سے کام کرتا ہے۔یوگ خواتین کو ذہنی دباؤ سے نجات دیتا ہے، جس سے ان کی جسمانی صحت پر مثبت اثر پڑتا ہے۔روزانہ یوگ کرنے والی خواتین زیادہ پراعتماد، خوش مزاج اور فعال رہتی ہیں۔ وہ اپنی ذمہ داریوں کو بہتر انداز میں انجام دے سکتی ہیں اور زندگی میں توازن برقرار رکھتی ہیں۔اکثر خواتین ذہنی دباؤ اور پریشانی کی وجہ سے زیادہ کھانا کھانے لگتی ہیں۔ان کی اس عادت کی وجہ سے وزن تیزی سے بڑھ سکتا ہے لیکن یوگ ذہنی سکون فراہم کرتا ہے۔مراقبہ اور سانس کی مشقیں ذہن کو آرام دیتی ہیں، جس سے بے چینی کم ہوتی ہے اور غیر ضروری کھانے کی عادت پر قابو پانے میں مدد ملتی ہے۔ جب ذہن پُرسکون ہو تو انسان اپنی غذا اور صحت پر بہتر توجہ دے سکتا ہے۔

4۔ماہواری اور حمل کے مسائل میں کمی

ماہواری عورت کی زندگی کا ایک فطری اور اہم حصہ ہے۔اس دوران جسم میں ہارمونز کی تبدیلیاں ہوتی ہیں جن کی وجہ سے درد، کمزوری، تھکن، چڑچڑاپن، ذہنی دباؤ اور بے چینی جیسی کیفیت پیدا ہوسکتی ہے۔ بہت سی خواتین ان دنوں میں جسمانی اور ذہنی تکلیف

محسوس کرتی ہیں۔ ایسے میں یوگ کارآمد ثابت ہوتا ہے جس میں سانس کی مشقیں، جسمانی حرکات اور ذہنی سکون کی تکنیکیں شامل ہوتی ہیں۔ یوگ نہ صرف جسم کو مضبوط بناتا ہے بلکہ ذہن کو بھی پرسکون کرتا ہے۔ ماہواری کے دوران یوگ خواتین کے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔ذیل میں چند فائدے درج ہیں:

(i) ماہواری کے دوران پیٹ، کمر اور ٹانگوں میں درد عام بات ہے۔ یوگ کی نرم اور ہلکی ورزشیں جسم کے پٹھوں کو آرام دیتی ہیں اور خون کی روانی بہتر بناتی ہیں، جس سے درد میں کمی آتی ہے۔

(ii) ہارمونز کی تبدیلی کی وجہ سے خواتین اکثر موڈ سوئنگ، غصہ یا اداسی محسوس کرتی ہیں۔ یوگ ذہن کو سکون دیتا ہے اور ذہنی دباؤ کو کم کرتا ہے۔ گہری سانس لینے کی مشقیں دل و دماغ کو پرسکون بناتی ہیں۔

(iii) ماہواری کے دوران کمزوری اور تھکن محسوس ہونا عام ہے۔ یوگ جسم میں توانائی پیدا کرتا ہے اور خواتین کو ہلکا اور متحرک محسوس کرواتا ہے۔

(iv) جسم میں خون کی گردش کو بہتر بناتا ہے، جس سے ماہواری کا نظام متوازن رہتا ہے اور جسمانی تکلیف کم ہوتی ہے۔

(v) بہت سی خواتین ماہواری کے دوران بے خوابی یا بے آرامی محسوس کرتی ہیں۔ یوگ اعصاب کو سکون دیتا ہے اور بہتر نیند میں مدد کرتا ہے۔

ماہواری کے دوران مفید یوگ آسنوں میں سے بالاسن ہے جو کمر اور پیٹ کے درد کو کم کرنے میں مدد دیتا ہے اور جسم کو سکون پہنچاتا ہے۔بھدرآسن، یہ ورزش جسم کے نچلے حصے میں خون کی روانی بہتر بناتی ہے اور ماہواری کے درد میں آرام دیتی ہے۔شواسن، جو مکمل ذہنی اور جسمانی سکون فراہم کرتا ہے اور تناؤ کم کرتا ہے۔اگر درد زیادہ ہو تو ماہر ڈاکٹر سے مشورہ لینا ضروری ہے۔

خواتین کی زندگی کا ایک نہایت حساس مرحلہ حمل کا ہوتا ہے۔ اس دوران جسم میں کئی تبدیلیاں آتی ہیں جن سے کمزوری، درد اور تھکن پیدا ہوسکتی ہے۔ یوگ حاملہ خواتین کے لیے بہت مفید سمجھا جاتا ہے۔ مناسب اور ہلکے آسن جسم کو مضبوط بناتے ہیں، کمر درد کم کرتے ہیں، ذہنی سکون اور جسمانی توازن برقرار رکھتے ہیں اس کے علاوہ بچے کی بہتر نشوونما میں بھی مدد ملتی ہے۔چونکہ یوگ سانس کی مشقوں کے ذریعے خواتین کو ذہنی سکون فراہم کرتا ہے اس لیے زچگی کے دوران خواتین میں اعتماد اور قوت برداشت میں اضافہ ہوتا ہے۔

5۔ بڑھتی عمر کے اثرات کم کرنا

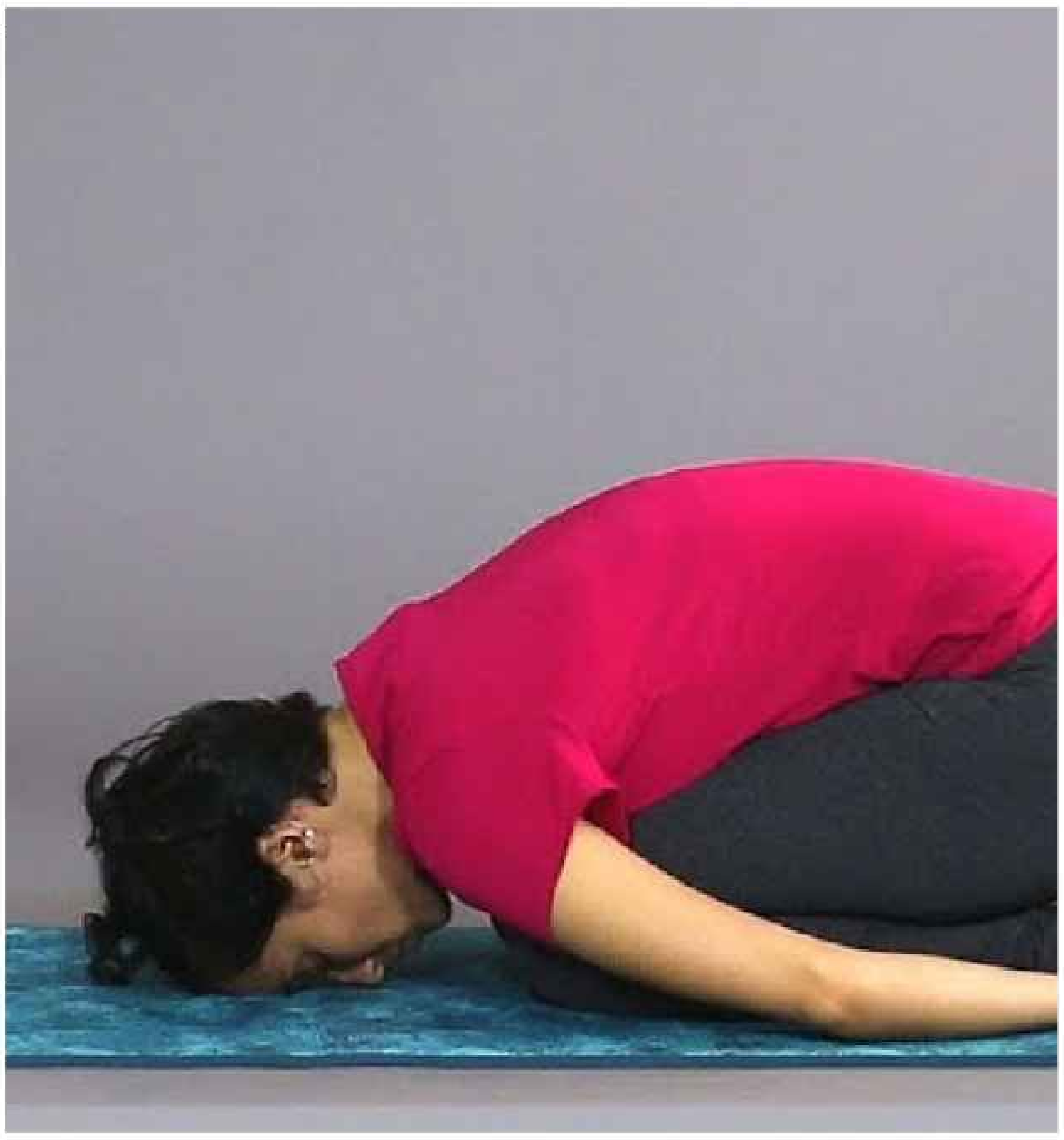

عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ خواتین کے جسم اور ذہن پر اس کے اثرات مختلف انداز میں ظاہر ہوتے ہیں۔ وقت کے ساتھ جلد کی لچک کم ہونا، جسمانی کمزوری، ہڈیوں کی نرمی، ذہنی دباؤ، ہارمونز میں تبدیلی اور تھکن جیسی مشکلات عام ہو جاتی ہیں۔ایسے میں یوگ ایک بہترین قدرتی طریقہ ہے جو خواتین کو نہ صرف جسمانی طور پر مضبوط بناتا ہے بلکہ ذہنی سکون اور تازگی بھی فراہم کرتا ہے۔عمر کی مسلسل گردش خواتین کے جسم کو کمزور کر دیتی ہے۔ یوگ ہڈیوں کو مضبوط بناتا ہے، جوڑوں کے درد کو کم کرتا ہے اور جسم کو چاق و چوبند رکھتا ہے۔عمر بڑھنے کے ساتھ خواتین میں ہڈیوں کی کمزوری یعنی آسٹیوپوروسس کا خطرہ بڑھ جاتا ہے، خاص طور پر مینوپاز کے بعد۔ یوگ ہڈیوں اور جوڑوں کو مضبوط بنانے میں مدد دیتا ہے۔اس کے علاوہ خواتین کے جسم میں ہارمونز کی تبدیلیاں بھی مختلف مسائل پیدا کرتی ہیں جیسے موڈ میں تبدیلی، بے چینی، کمزوری اور بے خوابی۔

خواتین کی عمر کے مختلف مراحل، خصوصاً مینوپاز، میں ہارمونل تبدیلیاں جسم اور ذہن دونوں پر اثر ڈالتی ہیں۔ یوگ ہارمونز کے توازن کو بہتر بنانے میں مدد کرتا ہے اور ان تبدیلیوں کے اثرات کو کم کرتا ہے جس سے جسمانی اور ذہنی حالت بہتر رہتی ہے اور خواتین خود کو زیادہ پرسکون محسوس کرتی ہیں۔

بڑھتی عمر کے ساتھ خواتین اکثر ذہنی دباؤ، تنہائی، بے خوابی اور بے چینی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ یوگ ذہن کو پرسکون کرنے میں بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ گہری سانس کی مشقیں اور مراقبہ دماغ کو سکون دیتے ہیں اور منفی خیالات کو کم کرتے ہیں۔ مسلسل یوگ سے جہاں جوڑوں کے درد میں کمی آتی ہے، خون کی روانی بہتر ہوتی ہے، جلد تک زیادہ آکسیجن پہنچتی ہے وہیں چہرے پر قدرتی چمک، جھریوں میں کمی، جلد میں تازگی برقرار رہتی ہے اور ساتھ ہی قبل از وقت بڑھاپے کے آثار کو کم کرنے میں یہ فائدے مند ثابت ہوتا ہے۔ یوگ دل کی صحت کو بہتر بناتا ہے اور سانس کے نظام کو مضبوط کرتا ہے۔ اس سے بلڈ پریشر متوازن رہتا ہے اور جسم میں توانائی برقرار رہتی ہے۔ غرض یوگ خواتین کی عمر بڑھنے میں پیدا ہونے والے مسائل کو کم کرنے میں مدد دیتا ہے۔

6۔اعتماد میں اضافہ

خود اعتمادی انسان کی اندرونی طاقت کا نام ہے۔ جب عورت جسمانی طور پر صحت مند، ذہنی طور پر پرسکون اور جذباتی طور پر متوازن ہوتی ہے تو اس کے اندر اعتماد خود بخود پیدا ہوتا ہے۔ یوگ انسان کے جسم، دماغ اور روح کو ایک دوسرے کے قریب لاتا ہے، جس سے عورت اپنی صلاحیتوں کو بہتر انداز میں پہچانتی ہے۔ آج کی مصروف اور دباؤ بھری زندگی میں خواتین کو گھر، تعلیم، ملازمت اور معاشرتی ذمہ داریوں کے درمیان توازن قائم کرنا پڑتا ہے۔ ان تمام ذمہ داریوں کے باعث ذہنی دباؤ، تھکن اور خود اعتمادی میں کمی پیدا ہوسکتی ہے۔ ایسے حالات میں یوگ ایک بہترین ذریعہ ہے جو نہ صرف جسمانی صحت کو بہتر بناتا ہے بلکہ خواتین کی ذہنی طاقت، اعتماد اور شخصیت کو بھی نکھارتا ہے۔ بہت سی خواتین اپنی شکل، وزن یا معاشرتی دباؤ کی وجہ سے احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتی ہیں۔ یوگ خواتین کو یہ سکھاتا ہے کہ اصل خوبصورتی اندرونی سکون اور صحت میں ہے۔ یوگ کے ذریعے عورت اپنے آپ کو قبول کرنا سیکھتی ہے، جس سے اس کی خود اعتمادی بڑھتی ہے۔ چونکہ یوگ ایک پرسکون ماحول میں کی جانے والی ورزش ہے جو انسان کو صبر، برداشت اور مثبت رویہ سکھاتا ہے، خواتین زندگی کے مختلف مسائل اور مشکلات کا سامنا زیادہ حوصلے اور ہمت کے ساتھ کر سکتی ہیں۔ روزانہ یوگ کرنے سے دماغ ایک نکتہ پر توجہ مرکوز کرنے میں ماہر ہوجاتا ہے اور خواتین پر اس کے مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں مثال کے طور پر وہ اپنے کام، تعلیم یا گھریلو معاملات میں زیادہ یکسوئی سے اور بہتر فیصلے کر پاتی ہیں۔ یہ صلاحیت ان کے اعتماد کو مزید مضبوط کرتی ہے۔ جو خواتین ذہنی سکون اور اعتماد رکھتی ہیں وہ دوسروں کے ساتھ بہتر تعلقات قائم کرتی ہیں۔ نتیجتاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ یوگ خواتین کے اندر مثبت توانائی پیدا کرتا ہے جس سے ان کی گفتگو، رویہ اور شخصیت میں کشش پیدا ہوتی ہے۔

7۔پرسکون نیند

یوگ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ذہنی سکون کا بہترین ذریعہ ہے۔ جب خواتین روزانہ یوگ کرتی ہیں تو جسم میں موجود تناؤ کم ہونے لگتا ہے۔ مختلف سانس کی مشقیں اور مراقبہ ذہنی دباؤ کو دور کرتے ہیں، جس سے دماغ پُرسکون ہوتا ہے اور نیند بہتر آتی ہے۔ کئی خواتین بے چینی، ڈپریشن یا زیادہ سوچنے کی عادت کا شکار ہوتی ہیں، ان کے لیے یوگ بہت فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔ اکثر کچھ خواتین دن بھر کے کام کے باوجود رات کو سکون سے نہیں سو پاتیں کیونکہ جسمانی اور ذہنی تھکن متوازن نہیں ہوتی۔ یوگ جسم کے پٹھوں کو آرام دیتا ہے اور خون کی گردش بہتر بناتا ہے۔ جس سے جسم میں ہلکا پن محسوس ہوتا ہے اور نیند جلد آتی ہے۔ گہری سانس لینے کی یوگ مشقیں جیسے پرانایام جسم اور دماغ دونوں کو آرام دیتی ہیں۔ یہ مشقیں دل کی دھڑکن کو متوازن کرتی ہیں اور دماغ کو سکون پہنچاتی ہیں۔ سونے سے پہلے چند منٹ کی سانس کی مشق بے خوابی کو

کم کرسکتی ہے۔ بہت سی خواتین بے خوابی یا بار بار آنکھ کھلنے کی شکایت کرتی ہیں۔ یوگ نیند کے قدرتی نظام کو بہتر بناتا ہے۔ روزانہ چند آسان آسن جیسے بالاسن، شواسن اور وجرآسن کرنے سے نیند گہری اور پرسکون ہو جاتی ہے۔ یہ خواتین میں مثبت سوچ، خود اعتمادی اور اندرونی سکون پیدا کرتا ہے۔ جب ذہن خوش اور مطمئن ہوتو نیند بھی بہتر ہوتی ہے۔ ماہرِ صحت کے مطابق نیند کی کمی بھی وزن بڑھانے کا سبب بن سکتی ہے۔ جب نیند مکمل ہوتو جسم صحت مند رہتا ہے اور وزن کم کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ یوگ سے خواتین بہتر، گہری اور پرسکون نیند حاصل کرسکتی ہیں، جس سے ان کی مجموعی صحت اور زندگی خوشگوار بن جاتی ہے۔

8۔ روحانی فوائد

یوگ صرف جسمانی ورزش نہیں بلکہ روح کے سکون کا ذریعہ بھی ہے۔ یہ انسان کو مثبت سوچنے، صبر کرنے اور زندگی کو بہتر انداز میں گزارنے کا سبق دیتا ہے۔ یوگ کے ذریعے انسان اپنے اندرونی احساسات کو سمجھتا ہے اور اللہ کی نعمتوں پر شکر ادا کرنا سیکھتا ہے۔ یوگ کی سب سے بڑی روحانی خوبی یہ ہے کہ یہ دل و دماغ کو سکون دیتا ہے۔ سانس کی مشقیں اور مراقبہ عورت کے اندرونی اضطراب کو کم کرتے ہیں۔ جب ذہن پرسکون ہوتا ہے تو انسان خود کو اپنے رب کے قریب محسوس کرتا ہے اور دل میں اطمینان پیدا ہوتا ہے۔ یوگ خواتین کو اپنی ذات کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ مسلسل مراقبہ اور خاموشی کی مشق انسان کو اپنے خیالات، احساسات اور جذبات پر غور کرنے کا موقع دیتی ہے۔ اس سے عورت اپنی صلاحیتوں اور کمزوریوں کو پہچانتی ہے اور زندگی کو زیادہ مثبت انداز میں دیکھتی ہے۔ روحانی طور پر یوگ انسان کے اندر موجود منفی سوچ، خوف، غصہ اور حسد جیسے جذبات کو کم کرتا ہے۔ مثبت توانائی بڑھنے سے عورت کے رویے میں نرمی، محبت اور برداشت پیدا ہوتی ہے۔ وہ دوسروں کے ساتھ بہتر تعلقات قائم کرنے کے قابل ہوتی ہے۔ یوگ انسان کو تحمل اور صبر سکھاتا ہے۔ خواتین جب روزانہ یوگ کرتی ہیں تو ان کے اندر برداشت اور سکون پیدا ہوتا ہے۔ وہ مشکلات کا سامنا زیادہ ہمت اور حوصلے کے ساتھ کرتی ہیں۔ یوگ عورت کے دل میں امید اور مثبت سوچ پیدا کرتا ہے۔ روحانی سکون کی وجہ سے وہ چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو محسوس کرتی ہے اور زندگی کے ہر لمحے کو بہتر انداز میں جیتی ہے۔

یوگ کے دوران مراقبہ اور گہری سانسیں روحانی توانائی کو بیدار کرتی ہیں۔ اس سے عورت کے اندر اعتماد، امید اور زندگی سے محبت بڑھتی ہے۔ وہ خود کو اندر سے مضبوط محسوس کرتی ہے اور زندگی کے مسائل کو بہتر انداز میں حل کرتی ہے۔ پرسکون ذہن انسان کو شکرگزاری کی طرف لے جاتا ہے۔ یوگ کے ذریعے عورت اپنی زندگی، صحت اور خاندان کی نعمتوں کو زیادہ محسوس کرتی ہے۔ اس کے اندر قناعت اور شکر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے جو روحانی خوشی کا سبب بنتا ہے۔ روحانی سکون کی وجہ سے خواتین کی نیند بہتر ہوتی ہے۔ جب ذہن بے سکون نہ ہوتو انسان گہری اور پرسکون نیند سوتا ہے۔ اس سے دن بھر توانائی اور خوش مزاجی برقرار رہتی ہے۔

اگر خواتین صحت مند ہوں گی تو پورا خاندان خوشحال ہوگا۔ ایک صحت مند ماں اپنے بچوں کی بہتر تربیت کرسکتی ہے۔ اسی لیے معاشرے میں خواتین کی صحت کو اہمیت دینا ضروری ہے اور یوگ اس مقصد کے حصول کا ایک آسان اور موثر ذریعہ ہے۔

مختصراً یوگ خواتین کی زندگی میں ایک مثبت تبدیلی لاسکتا ہے۔ یہ نہ صرف جسمانی صحت کو بہتر بناتا ہے بلکہ ذہنی سکون، جذباتی توازن اور خود اعتمادی میں بھی اضافہ کرتا ہے۔ ایک پُراعتماد عورت نہ صرف اپنی زندگی بہتر بناتی ہے بلکہ اپنے خاندان اور معاشرے کے لیے بھی مثال بنتی ہے۔ اس لیے خواتین کو چاہیے کہ وہ اپنی روزمرہ زندگی میں یوگ کو شامل کریں تاکہ وہ صحت مند، خوشحال اور پُراعتماد زندگی گزار سکیں۔

❐❖❐

Asna Sahar
B-213 G.T.B. Nagar,
Kareli, Prayagraj-211016 (U.P)
asnasahar93@gmail.com

یوگا خواتین کی صحت اوراعتماد کی نئی راہ

نوی رضا خان

جدید زندگی کی تیز رفتار، بڑھتی ہوئی ذمہ داریوں اور ذہنی دباؤ نے آج کے معاشرے کو کئی جسمانی اور ذہنی مسائل کی طرف دھکیل دیا ہے۔ آج خاص طور پر خواتین کی زندگی مختلف ذمہ داریوں کے توازن میں گزرتی ہیں۔ ایک عورت اپنی صحت پر اتنی توجہ نہیں دے سکتی جب وہ گھر، خاندان، بچوں، تعلیم، ملازمت اور سماجی زندگی کی ذمہ داریاں پوری کر رہی ہو۔ نتیجتاً، دباؤ، تھکن، بے خوابی، موٹاپا، عدم توازن اور خود اعتمادی کی کمی جیسے مسائل بڑھ رہے ہیں۔ ایسی صورتحال میں، یوگا خواتین کے لیے صحت مند، متوازن اور پراعتماد زندگی گزارنے کا ایک نیا طریقہ بن چکا ہے۔ یوگا ایک قدیم بھارتی طریقہ ہے جس کا مقصد جسم، ذہن اور روح کے درمیان توازن قائم کرنا ہے، جو انسان کو اندر سے مضبوط بناتا ہے۔ آج، یوگا کو دنیا بھر میں جسمانی صحت، ذہنی سکون اور مثبت طرز زندگی کے لیے اپنایا جا رہا ہے۔ خواتین کی زندگی میں یوگا کی اہمیت بھی بڑھ جاتی ہے کیونکہ یہ نہ صرف انہیں جسمانی طور پر صحت مند بناتا ہے بلکہ ذہنی طور پر بھی مضبوط بناتا ہے۔ یوگا خود اعتمادی اور مثبت سوچ کو بڑھانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

یوگا کا مطلب اور اہمیت

لفظ 'یوگا' سنسکرت جڑ 'یوج' سے ماخوذ ہے، جس کا مطلب ہے اتحاد قائم کرنا۔ یوگا جسم، ذہن اور روح کو ہم آہنگ کرنے کا عمل ہے۔ بھارتی ثقافت میں، یوگا کو ہزاروں سالوں سے صحت اور روحانی نشوونما کا ذریعہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ آج کے سائنسی دور میں بھی، یوگا کی افادیت کو عالمی سطح پر تسلیم کیا گیا ہے۔ اقوام متحدہ کی جانب سے 21 جون کو "بین الاقوامی یوم یوگا" قرار دینا اس کی عالمی مقبولیت اور اہمیت کا ثبوت ہے۔ یوگا نہ صرف بیماریوں کے علاج کا ذریعہ ہے بلکہ یہ صحت مند طرز زندگی اپنانے کا فن بھی سکھاتا ہے۔ باقاعدہ یوگا کرنے سے جسم لچکدار ہو جاتا ہے، ذہن پرسکون اور خیالات مثبت ہو جاتے ہیں۔

یوگا کا خواتین کی صحت پر اثرات

خواتین کی صحت صرف ایک انفرادی موضوع نہیں بلکہ پورے خاندان اور معاشرے سے جڑی ہوئی ہے۔ اگر عورت صحت مند ہے تو خاندان اور معاشرہ بھی صحت مند اور متوازن ہوں گے۔ یوگا خواتین کی صحت پر کئی سطحوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔

1. جسمانی صحت کو بہتر بنائیں

باقاعدہ یوگا جسم کے پٹھوں کو مضبوط بناتا ہے اور جسم میں توانائی برقرار رکھتا ہے۔ یوگا موٹاپے کو کم کرنے، ہاضمہ کے نظام کو مضبوط بنانے اور جسم کو متحرک رکھنے میں مددگار ہوتا ہے۔ آج کل بہت سی خواتین تھائرائیڈ، ذیابیطس، ہائی بلڈ پریشر اور کمر درد جیسے مسائل سے

دوچار ہیں۔ یوگا ان مسائل پر قابو پانے میں مدد دیتا ہے۔ خاص طور پر، سوریا نمسکار، بھوجنگسنا، تداسانا اور پرانا یام خواتین کی صحت کے لیے بہت فائدہ مند سمجھے جاتے ہیں۔

2. ذہنی دباؤ کو کم کرنا

خواتین اکثر خاندانی اور کام کی ذمہ داریوں کی وجہ سے ذہنی دباؤ کا سامنا کرتی ہیں۔ مسلسل دباؤ بے چینی، ڈپریشن اور بے خوابی جیسے مسائل کا باعث بنتا ہے۔ یوگا اور مراقبہ ذہن کو پرسکون کرنے میں انتہائی مؤثر ہیں۔ پرانا یام اور مراقبہ کی مشق ذہنی دباؤ کو کم کرتی ہے اور اندر سے پرسکون اور مثبت محسوس کراتی ہے۔ یوگا خواتین کو جذباتی طور پر متوازن بناتا ہے۔

3. ہارمونی توازن

خواتین کی زندگیوں میں بہت سی جسمانی تبدیلیاں آتی ہیں جیسے نوجوانی، حمل اور مینوپاز۔ ان تبدیلیوں کے دوران، ہارمونی عدم توازن کئی مسائل کا باعث بنتا ہے۔ یوگا جسم میں ہارمونز کے توازن کو برقرار رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ ماہواری کے مسائل ان خواتین میں نسبتاً کم عام ہیں جو باقاعدہ یوگا کرتی ہیں۔

4. مدافعت میں اضافہ

یوگا جسم کی مدافعت بڑھانے میں بھی مددگار رہے۔ باقاعدہ یوگا کرنے سے جسم بیماریوں سے لڑنے کے لیے زیادہ قابل ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ COVID-19 وبا کے دوران بھی، لوگوں نے یوگا اور پرانا یام کی افادیت کو سمجھا۔

خود اعتمادی بڑھانے میں یوگا کا کردار

صحت کے ساتھ ساتھ، خود اعتمادی بھی خواتین کی زندگی میں انتہائی اہم ہے۔ ایک پراعتماد عورت زندگی کے چیلنجز کا زیادہ مضبوطی سے مقابلہ کر سکتی ہے۔ یوگا خواتین میں خود اعتمادی بڑھانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ جب کوئی شخص جسمانی اور ذہنی طور پر صحت مند محسوس کرتا ہے تو اس کا اعتماد خود بخود بڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔ یوگا خود قبولیت اور خود اعتمادی کا احساس پیدا کرتا ہے۔ یہ خواتین کو یہ سمجھنے میں مدد دیتا ہے کہ اصل خوبصورتی صرف ظاہری شکل میں نہیں، بلکہ ذہنی سکون اور مثبت سوچ میں بھی ہے۔ آج، سوشل میڈیا اور جدید طرز زندگی کی وجہ سے، بہت سی خواتین خود کو دوسروں سے موازنہ کرنا شروع کر دیتی ہیں، جس سے خود اعتمادی متاثر ہوتی ہے۔ یوگا انسان کو خود سے جڑنا سکھاتا ہے اور اندر کی طاقت کو پہچاننے میں مدد دیتا ہے۔

کام کرنے والی خواتین کے لیے یوگا

آج بہت سی خواتین کام کی جگہ پر سرگرم ہیں۔ وہ گھر اور کام دونوں ذمہ داریاں سنبھالتی ہیں۔ مسلسل کام کی وجہ سے جسمانی تھکن اور ذہنی دباؤ میں اضافہ فطری بات ہے۔ ایسی صورت میں، یوگا کام کرنے والی خواتین کے لیے بہت مفید ہے۔ صبح میں کچھ وقت یوگا اور مراقبہ کرنے سے دن بھر توانائی برقرار رہتی ہے۔ یہ کارکردگی کو بڑھاتا ہے اور دباؤ کو کم کرتا ہے۔ اب کئی دفاتر اور اداروں میں یوگا سیشنز منعقد کیے جا رہے ہیں، جس سے ملازمین کی ذہنی صحت اور پیداواریت میں بہتری آئی ہے۔

لڑکیوں اور نوجوان خواتین کے لیے یوگا

نئی نسل کے طلباء تعلیم، مقابلے، اور کیریئر کے دباؤ کی وجہ سے دباؤ کا سامنا کر رہے ہیں۔ موبائل اور ڈیجیٹل طرز زندگی نے جسمانی سرگرمی کو بھی کم کیا ہے۔ یوگا لڑکیوں کو ذہنی توجہ، خود نظم و ضبط اور مثبت سوچ پیدا کرنے میں مدد دیتا ہے۔ باقاعدگی سے یوگا کرنے سے یادداشت کی طاقت اور توجہ مرکوز کرنے کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا

ہے۔ اسکولوں اور کالجوں میں یوگا کی تعلیم کو فروغ دینے کی ضرورت ہے تاکہ نوجوان نسل صحت مند اور متوازن طرز زندگی اپنا سکے۔

یوگا اور خواتین کو بااختیار بنانا

خواتین کی بااختیاری صرف معاشی خودمختاری تک محدود نہیں ہے۔ حقیقی خودمختاری اس وقت ممکن ہوتی ہے جب عورت جسمانی، ذہنی اور جذباتی طور پر مضبوط ہو۔ یوگا خواتین کو اندر سے مضبوط بناتا ہے۔ یہ انھیں خودمختار، پراعتماد اور مثبت بناتا ہے۔ یوگا خواتین میں قیادت اور فیصلہ سازی کی طاقت بھی پیدا کرتا ہے۔ آج بہت سی خواتین معاشرے میں صحت کی آگاہی پھیلانے کے لیے یوگا انسٹرکٹر بن کر کام کر رہی ہیں۔ یہ نہ صرف ان کے اعتماد کو بڑھاتا ہے بلکہ دوسری خواتین کو بھی متحرک کرتا ہے۔

معاشرے اور خاندان کا کردار

خاندان میں خواتین کی صحت کو اکثر ترجیح نہیں دی جاتی۔ بہت سی خواتین اپنے خاندان کی دیکھ بھال میں اتنی مصروف ہوتی ہیں کہ اپنے لیے وقت نکال نہیں پاتیں۔ معاشرے اور خاندان کو خواتین کی صحت کی اہمیت کو سمجھنا چاہیے۔ اگر خاندان خواتین کو یوگا اور صحت کے لیے وقت دیتا ہے تو اس کا پورے خاندان پر مثبت اثر پڑے گا۔ خاندانی حمایت خواتین کی خود اعتمادی بڑھانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ایک صحت مند اور خوش عورت پورے خاندان میں مثبت ماحول پیدا کرتی ہے۔

حاصل کلام

یوگا آج خواتین کے لیے صحت مند اور متوازن زندگی کا ایک نیا طریقہ بن چکا ہے۔ یہ نہ صرف جسم کو صحت مند رکھتا ہے بلکہ ذہن کو بھی پرسکون کرتا ہے اور خود اعتمادی کو مضبوط کرتا ہے۔ جدید زندگی کے چیلنجز کے درمیان، یوگا خواتین کو ذہنی طاقت، مثبت سوچ اور خود اعتمادی فراہم کرتا ہے۔ یہ انھیں اپنی زندگی کو زیادہ منظم، صحت مند اور خوشگوار بنانے کی ترغیب دیتا ہے۔ آج خواتین کو یوگا کو اپنی روزمرہ زندگی کا حصہ بنانے کی ضرورت ہے۔ اسکولوں، کالجوں اور سماجی اداروں کو بھی یوگا کے بارے میں آگاہی بڑھانے کے لیے کام کرنا چاہیے۔ صرف ایک صحت مند اور پراعتماد عورت ہی ایک صحت مند خاندان، بااختیار معاشرے اور ترقی یافتہ قوم کی بنیاد بن سکتی ہے۔ لہٰذا یہ کہنا مناسب ہوگا کہ یوگا واقعی خواتین کی صحت اور خود اعتمادی کا آزمودہ راستہ ہے۔

❐❖❐

Navi Raza Khan
Research Scholar
College of Teacher Education
Darbhanga-846001(Bihar)
Mob+:.91-9304099184
Email-navirazamanuu@gmail.com

شفا مریم

غزلیں

بے زبانی کی عجب رسم نبھانی ہے مجھے
اپنی خاموشی سے ہر بات بتانی ہے مجھے

دل کے زخموں کو زمانے سے چھپاتی ہوں مگر
اپنی دلسوز کہانی بھی دکھانی ہے مجھے

خواب آنکھوں میں سجا کر بھی بکھر جاتے ہیں
روز پھر خوابوں کی محفل بھی سجانی ہے مجھے

اپنے احساس کو الفاظ میں کیسے ڈھالوں
جب نگاہوں سے بھی ہر بات چھپانی ہے مجھے

ہر غلط بات کو سن کر جو لہو ہوتا ہے
یہ کہانی دل مضطر کو سنانی ہے مجھے

ہے تقاضا الفت کا بے ادب ہوا جائے
پھر تمھاری باتوں کو غور سے سنا جائے

تم ہو آشنا کچھ کچھ، میں بھی کچھ شناسا ہوں
ہم کو ایک دوجے سے باخبر کیا جائے

بے زبان شہروں میں بازباں نہیں ملتے
ہم سخن کہاں ڈھونڈیں بے سخن لکھا جائے

شہر کے خرابے میں اک اضافہ میں بھی ہوں
کس طرح کٹے وحشت دل کا کیا کیا جائے

اس جہاں میں سب کے سب باوفا نہیں ملتے
اب یہ چاہتا ہے دل بے وفا بنا جائے

Shifa Maryam
Guest Faculty
Department of Urdu
AMU
Aligarh-202002(U.P)
Mob: 8979931287
shifamaryam35@gmail.com

مسز فرحانہ نازنین

غزلیں

تیری چاہت کی کئی سوغات باقی ہے ابھی
دل کے موسم میں مرے برسات باقی ہے ابھی

جاچکا وہ شخص لیکن در کھلا سا ہے ابھی
خاموشی میں بھی کوئی اک ذات باقی ہے ابھی

وقت کہتا ہے کہانی ہے ادھوری سی کئی
ہر فسانے میں کئی اک بات باقی ہے ابھی

چاند ڈوبا ،بزم سونی ،خواب ٹوٹے ہیں کئی
یاد کی شمعوں میں ایک سوغات باقی ہے ابھی

میرے ہوٹوں میں ترے ہوٹوں کی رنگت آ گئی
غنچۂ دل کھل اٹھا پر بات باقی ہے ابھی

موجوں میں گھرا ہوں،ابھی ڈوبا تو نہیں ہوں
مٹی سے بنا ہوں، مگر کچا تو نہیں ہوں

ساحل پہ کھڑا ہوں یہاں ، دریا کو نہ دیکھوں
آنکھیں یہ برستی رہیں ،اندھا تو نہیں ہوں

سرکار نے کچھ کام کیا ہے، کہ نہیں ہے
بدحال سا بکھرا ہوں میں یکجا تو نہیں ہوں

پل بھر کو جو ٹھہرو تو ابھی دیکھ ہی لوگے
پرواز کو پر تول کہ،اڑتا تو نہیں ہوں

کس خواب میں غافل ہو،حقیقت کی خبر ہے
الجھا ہوا دکھتا ہوں میں ،الجھا تو نہیں ہوں

Mrs. Farhana Nazneen
C/o. Afsar Imam
Shahadat Market
Seva Drugs Agency
Begusarai-851101 (Bihar)
Mbl.9470705183

زبیدہ شکیل

شناسائی

محبت کیا ہے جاناں ۔۔۔؟
چلو تم کو بتاتا ہوں ۔۔
جہاں تک
میں
سمجھ پایا،
وہاں تک ہی
بتاتا ہوں ۔۔
محبت اک عنایت ہے ۔۔
کہیں لے جائے موسیٰ کو،
تجلی رب کی
دکھلانے ۔۔
کہیں محبوب کو
عرش بریں پر
کہیں سولی چڑھاتی ہے،
کسی منصور سرکش کو ۔۔
کہیں یہ ایڑیاں رگڑے،
تو زم زم پھوٹ پڑتے ہیں ۔۔
نظر کر دے جو پتھر پر،
تو پتھر ٹوٹ سکتے ہیں ۔۔
کہیں یہ قیس ہوتی ہے،
کہیں فرہاد ہوتی ہے،
کہیں سرسبز ہوتی ہے،
کہیں برباد ہوتی ہے ۔۔
محبت دھوپ میں
سایہ کے جیسی ہے ۔۔
کہیں یہ صبر دیتی ہے،
کہیں یہ اجر دیتی ہے،
کہیں یہ موم لگتی ہے،
کہیں یہ جبر ہوتی ہے،
کہیں مرجان ہوتی ہے،
کہیں یہ خاک ہوتی ہے،
بہت نایاب ہوتی ہے ۔۔۔۔۔۔

Zubaida Shakeel
Mohalla Hydrabad
Bilgiram
Distt Hardoi-241301 (U.P)
Email....zubushakeel87@gmail.com

افسانے

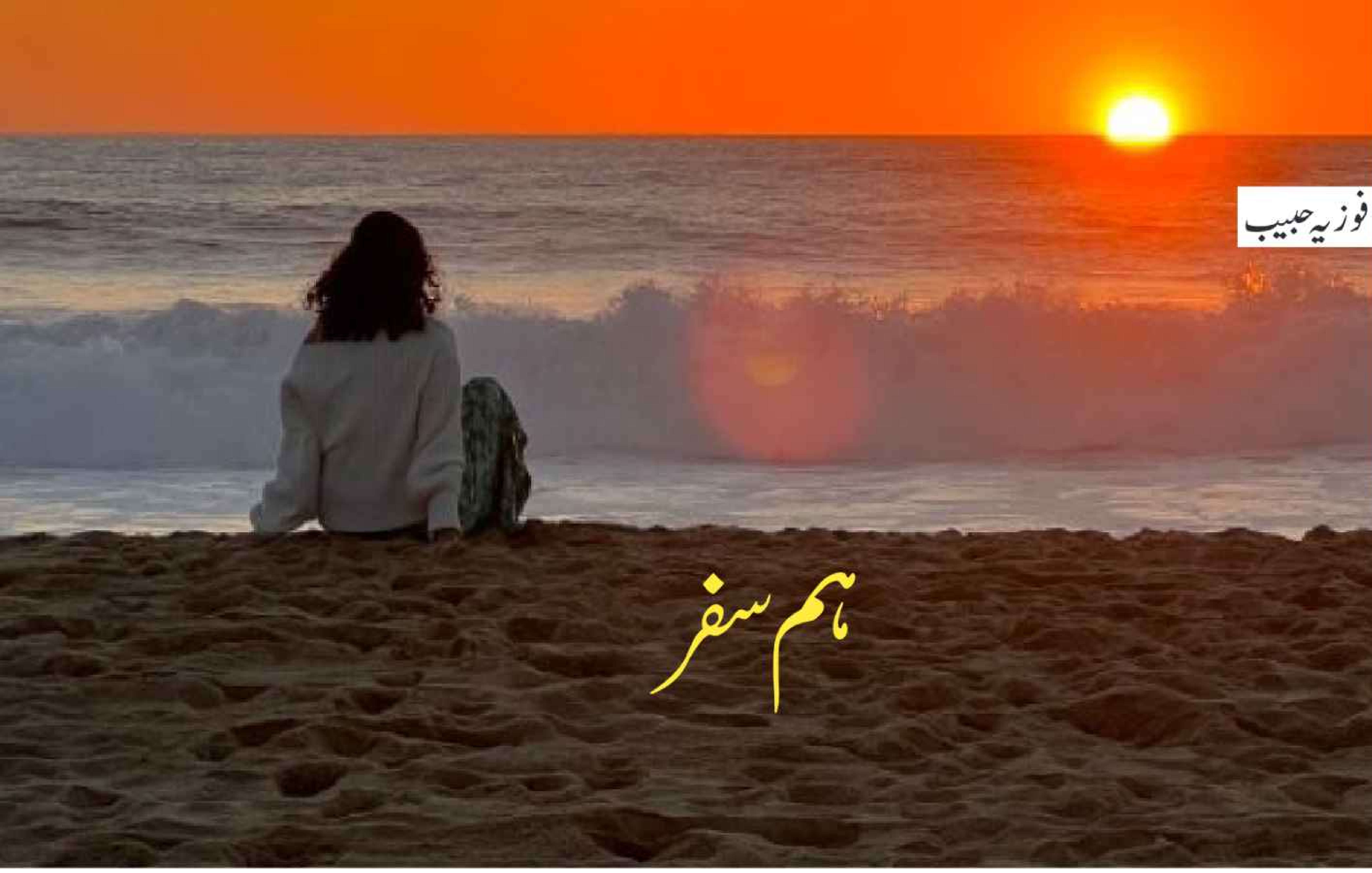

ہم سفر

فوزیہ حبیب

''بیٹا ! وہ بہت شرمندہ ہے۔دوبارہ رجوع کرنا چاہتا ہے ''

'' کیا مطلب ؟'' وہ ہکا بکا رہ گئی

'' حلالہ کے بعد وہ دوبارہ نکاح کرنا چاہتا ہے''

''اماں ؟ '' صدمے سے اس کی آواز گنگ ہوگئی

ابا نظریں چرا کر باہر نکل گئے۔بیٹی کے لیے ایسی بات کا تصور کرنا بھی ایک باپ کے لیے شرمندگی کا باعث تھا۔اس عظیم پلان کو انجام دینے والا ان کا اپنا سگا بھتیجا تھا۔غصے کا تیز مزاج انسان شادی کے ڈھائی سال بعد طلاق دے بیٹھا تھا۔اور اب پچھتا رہا تھا۔ وہ چھ ماہ کی بچی کو گود میں لیے اجڑ کر میکہ آ گئی۔اماں نے داماد سمیت ابا کے تمام خاندان کو جی بھر کر کوسا۔ابا کو جیسے چپ لگ گئی۔بھتیجے کے مزاج سے خوب واقف تھے لیکن اتنا بڑا قدم وہ اٹھالے گا۔اس کا تصور بھی نہ کیا تھا۔

اشعر نے ہی ابا کے دور پرے کے رشتہ دار کے لڑکے کا ذکر کیا۔خاور بارہویں پاس ایک فیکٹری میں ملازم تھا۔تایا نے خاور اور اس کے والد سے بات کی ۔بھتیجی اور اس کی بچی کی زندگی کا سوال تھا۔اس لیے خاور کے والد نے بات مان لی۔اگر چہ خاور اس بات کے لیے راضی نہیں تھا۔مگر اس کے باپ نے واسطہ دیا۔کبھی کبھی غربت بھی رشتہ داروں کے سامنے ذلیل کروا دیتی ہے۔

ویسے تو تایا اور ابا سمیت اس کے سارے دودھیال والے خاور کے گھر والوں کو منہ نہیں لگاتے تھے۔لیکن جب اشعر نے بنا سوچے سمجھے طلاق کا لیبل بھتیجی کے ماتھے پر لگا دیا تو تایا کو خاور کے گھر والے یاد آئے۔

''امی ! میں کسی بھی قیمت پر دوبارہ شادی نہیں کروں گی'' ماہین نے صاف انکار کر دیا

'' بیٹا ! اپنا نہیں تو اپنی بچی کا تو سوچو۔ بنا باپ کے تم اُسے کیسے پالوگی ؟

'' ایسے باپ سے تو نہ ہی رہنا بہتر ہے''

'' کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو۔اس مردود نے تو ہمیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا''

'' اور اوپر سے تمھاری تائی کا مزاج ،اشعر اپنی ماں پر ہی گیا ہے۔جب ہم ساتھ رہتے تھے تو تمھاری تائی کی اللہ بخشے اماں مرحومہ سے بالکل نہیں بنتی تھی'' اماں کے لہجے میں کڑواہٹ آ گئی

''اب بس کردیں اماں ! میں اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی''

'' یہ سب تمھارے باپ کا کیا دھرا ہے۔اچھی طرح جانتے تھے بھتیجے کے مزاج کو اور تمھاری تائی کی نخوت اور مغرور پن سے تو اس گھر کا بچہ بچہ واقف تھا۔لیکن نہ جی ! بھائی کی محبت اولاد کی محبت

پر غالب آگئی اور قربان ہوگئی میری اولاد۔''

اماں کے کوسنے جاری تھے اور اسے پتہ تھا کہ اس کا دورانیہ طویل ہوگا۔اس لیے وہ کھسک گئی۔

بی ایس سی کرتے ہی تایا نے اشعر کے لیے اس کا رشتہ مانگ لیا تھا۔ابا خوش ہوگئے۔اماں نے فوراً انکار کردیا۔تائی اور ان کے بچوں کے مزاج سے وہ خوب واقف تھیں۔اشعر ہائی کوالیفائیڈ ہینڈسم اور بہت بڑی کمپنی میں اعلیٰ عہدہ پر فائز تھا۔کوئی بھی لڑکی اس سے شادی کرنے کے لیے فوراً حامی بھر دیتی،اگر اس کی عادت سے واقف نہ ہو تو۔اس کے مزاج میں غصہ اور ہٹ دھرمی تو تھی ہی۔ماں کا نخوت بھرا انداز اور گھمنڈ بھی وراثت میں ملا تھا۔لیکن ابا نے اماں کو منالیا۔

اشعر غصیلا اور گھمنڈی ہونے کے ساتھ بہت موڈی بھی تھا۔کبھی بہت پیار جتاتا اور کبھی بری طرح اگنور کردیتا۔بات بات پر سب کے سامنے جھڑک دیتا تھا۔وہ خفت زدہ رہ جاتی۔اس کی عزتِ نفس مجروح ہوگئی تھی۔ چند مہینوں میں ہی وہ کملا کر رہ گئی۔ اس نے اماں ابا کو کچھ بھی نہیں بتایا وہ ہمیشہ ''سب کچھ ٹھیک ہے'' کا نمونہ بنی رہتی۔لیکن اماں تو ماں تھیں۔اس کا مرجھایا ہوا چہرہ سب کچھ بتادیتاتھا۔

ماہین سے شادی کر کے وہ خوش تھا اور وہ بھی اتنے خوبرو دولہا کو پا کر مسرور تھی۔سسرال بھی غیر نہیں تھا۔اشعر کی دونوں بہنیں اس کی پہلے سے ہی دوست تھیں۔تایا کا سلوک تو پہلے دن سے ہی شفقت بھرا تھا۔تائی کا رویہ بھی اچھا تھا۔وہ تھوڑا لیے دیے رہتی تھیں اور ماہین تو ان کے مزاج سے بخوبی واقف تھی۔وہ بہت آرام سے سسرال میں ایڈجسٹ ہوگئی۔اس کی دونوں نندوں سے بہت اچھی بنتی تھی۔اپنے گھر میں اکلوتی ہونے کی وجہ سے وہ بوریت کا شکار ہوجاتی تھی۔سسرال میں اس کا دل لگ گیا۔وہ میکے بھی کبھی کبھار آتی تھی۔

اشعر غصیلا اور گھمنڈی ہونے کے ساتھ بہت موڈی بھی تھا۔کبھی بہت پیار جتاتا اور کبھی بری طرح اگنور کردیتا۔بات بات پر سب کے سامنے جھڑک دیتا تھا۔وہ خفت زدہ رہ جاتی۔اس کی عزتِ نفس مجروح ہوگئی تھی۔ چند مہینوں میں ہی وہ کمہلا کر رہ گئی۔اس نے اماں ابا کو کچھ بھی نہیں بتایا وہ ہمیشہ ''سب کچھ ٹھیک ہے'' کا نمونہ بنی رہتی۔لیکن اماں تو ماں تھیں۔اس کا مرجھایا ہوا چہرہ سب کچھ بتا دیتا تھا۔

اُس دن ماہین کی خالہ نے ان دونوں کی دعوت کی تھی۔اشعر نے پہلے تو صاف منع کر دیا تھا۔لیکن تایا ابو نے اسے زبردستی دعوت میں جانے کے لیے راضی کیا۔وہ خراب موڈ کے ساتھ وہاں گیا

'' آپی ! آپ آج رات یہیں رک جائیں۔بہت مزہ آئے گا'' اس کی خالہ کے جڑواں بچوں نے کہا۔

'' نہیں میں کیسے رک سکتی ہوں ''

دونوں بچے ضد کرنے لگے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگے

'' تم لوگوں کو تمیز نہیں ہے کہ گھر آئے مہمان سے کیسے برتاؤ کرتے ہیں؟'' اشعر پھٹ پڑا۔اتنی دیر سے وہ برداشت کا مظاہرہ کر رہا تھا یہی بہت تھا۔تنتنا کر گاڑی میں جا بیٹھا خالہ اور خالو نے حیرت سے اسے دیکھا۔وہ نظریں چرا گئی

''اللہ حافظ خالہ'' وہ خالہ کے گلے لگ گئی۔خالو نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اس نے بچوں کو پیار کیا۔وہ بیچارے سہمے ہوئے کھڑے تھے۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی اس کی آنکھیں بھر آئیں

'' یہ شخص مجھے کہاں کہاں شرمندہ کرتا رہے گا''

اس نے کنکھیوں سے اسے دیکھا۔وہ لب بھینچے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔

'' آپ کو بچوں کو اس طرح ڈانٹنا نہیں چاہیے تھا''

'' بچے ؟ اتنے بڑے ہوگئے اور تمھیں بچے لگ رہے ہیں''

آٹھویں کلاس میں پڑھ رہے بچے اسے بدتمیز لگ رہے

تھے۔جی میں آیا کہہ دیں کہ آپ کی تربیت تو بہت اعلیٰ درجے پر ہوئی ہے۔مگرلب سل گئے۔

ایک سال میں ہی وہ تھک گئی تھی۔نہ جانے اس شخص کے ساتھ زندگی کیسے گزرے گی - ابا بھی بھتیجے کے رویے سے سخت پریشان تھے۔ اسی اثناء میں وہ پریگننٹ ہوگئی۔اس کے میکے اور سسرال میں سب خوش تھے۔اشعر کے رویہ سے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ خوش ہے یانہیں۔

اس کی گود رحمت سے بھر گئی۔وہ بہت خوش تھی۔میکے اور سسرال میں اس ننھی پری کا والہانہ استقبال کیاگیا۔اشعر بھی بہت خوش تھا۔باپ بننے کی خوشی میں سب بھول گیا۔بچی اس کے لیے واقعی رحمت تھی جس نے اشعر جیسے انسان کو بدل دیا تھا۔لیکن یہ اس کی خوش فہمی تھی۔ وہ پھر سے پرانی روش پر جانے لگا تھا۔اس کا پرانا روش پھرسے عود آیا تھا۔

ڈلیوری کے صرف پندرہ دن پہلے وہ میکے آئی تھی۔اس عرصے میں اشعر صرف ایک بار آیا تھا اس کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے اس کی سات پشتوں پر احسان کررہا ہو۔

اس کی گود رحمت سے بھر گئی۔وہ بہت خوش تھی۔میکے اور سسرال میں اس ننھی پری کا والہانہ استقبال کیا گیا۔اشعر بھی بہت خوش تھا۔باپ بننے کی خوشی میں سب بھول گیا۔بچی اس کے لیے واقعی رحمت تھی جس نے اشعر جیسے انسان کو بدل دیا تھا۔لیکن یہ اس کی خوش فہمی تھی۔ وہ پھر سے پرانی روش پر جانے لگا تھا۔اس کا پرانا روش پھر سے عود آیا تھا۔

اس دن اس کا موڈ ضرورت سے زیادہ آف تھا۔آفس میں اس کی کسی سے جھڑپ ہوگئی تھی اور اس نے اسے انا کا مسئلہ بنالیا تھا۔ وہ کمرے میں آیا تو ٹیبل پر بیگ پٹخ کر دروازہ زور سے بند کردیا

''پلیز ذرا آہستہ ! دعا ابھی ابھی سوئی ہے''اس نے دھیمی آواز میں کہا

''اس وقت میں بہت غصہ میں ہوں۔میرے منہ مت لگو''

''آپ کا تو یہ روز کا معمول ہے'' اس کی زبان پھسل گئی

''تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ میں پاگل ہوں''

''آپ بات کو غلط رخ دے رہے ہیں''

''مجھے مت سکھاؤ کہ مجھے کیا کرنا ہے''

''تمھاری زبان کچھ زیادہ نہیں چل رہی ہے ؟ اپنی اوقات میں رہو'' اشعر کو دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع مل گیا

''کیا ہے میری اوقات بتا دیں'' ماہین کے لہجے میں بھی تیزی آ گئی۔

''آج ابھی تین لفظ بول دوں تو دوکوڑی کی بھی نہیں رہوگی''

''کیا کہا آپ نے ؟ ایسی گھٹیا بات کرتے ہوئے آپ کو شرم نہیں آتی''

''ہاں میں گھٹیا بات ہی کرتا ہوں تو اور یہ گھٹیا انسان تمھیں ابھی اور اسی وقت طلاق دیتا ہے'' وہ گنگ رہ گئی۔ابھی وہ اس جھٹکے سے نکل بھی نہیں پائی تھی کہ اس نے دوبارہ وہ الفاظ دہرادئے جو حلال چیزوں میں سب سے ناپسندیدہ ہے۔وہ غش کھا کر گر پڑی۔

آواز سن کر تایا اور تائی دوڑتے ہوئے کمرے میں آئے۔ ڈریسنگ ٹیبل کے پاس بے سدھ پڑی ماہین کو دیکھا اور اشعر کو۔تایا نے لب بھینچ کر اشعر کو دیکھا

''تم نے اس پر ہاتھ اٹھایا ہے ؟''

وہ لب بھینچے بنا کچھ کہے باہر نکل گیا۔تائی نے پانی کے چھینٹے اس کے منہ پر مارے تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

''ماہی ! کیا ہوا ہے بیٹا ؟ کیا اشعر نے کوئی زیادتی کی ہے ؟''

وہ خالی خالی نظروں سے منہ تکنے لگی۔اس کا دماغ ماؤف ہوگیا اسی اثناء میں تایا کا موبائل بج اٹھا۔اشعر کا کال تھا اس سے پہلے کہ

وہ ہیلو کہتے دوسری طرف سے اس کی سرد آواز آئی

’’ آپ ماہین کو اس کے گھر چھوڑ آئیں۔ یا چچا سے کہیں کہ وہ آ کر اپنی بیٹی کو لے کر جائیں‘‘

’’ کیا مطلب ؟‘‘ تایا بوکھلا گئے

تایا نے تائی کو طلاق والی بات بتادی وہ بھی سکتے میں رہ گئیں۔اس کے بعد تایا کے منہ سے مغلظات کا وہ طوفان اٹھا کہ سنبھالنا مشکل ہوگیا۔

تھوڑے دنوں بعد ھی اشعر کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا تھا۔ وہ ماھین کو دوبارہ اپنی زندگی میں شامل کرنا چاھتا تھا اور اس کے لیے تایا نے خاور کا انتخاب کیا۔

اماں نے ممتا کا واسطہ دیکر ماھین کو شادی کے لیے راضی کر لیا۔ وہ چپ چاپ قربانی کا بکرا بنی خاور کے گھر چلی گئی۔

’’میں نے ماہین کو آزاد کر دیا ہے‘‘ کھٹاک سے فون بند کر دیا۔ تایا کے ہاتھ سے موبائل چھوٹ کر گر پڑا۔

’’ کیا کہا اشعر نے ؟‘‘

تایا نے تائی کو طلاق والی بات بتادی۔ وہ بھی سکتے میں رہ گئیں۔ اس کے بعد تایا کے منھ سے مغلظات کا وہ طوفان اٹھا کہ سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

تھوڑے دنوں بعد ہی اشعر کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ ماہین کو دوبارہ اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا تھا اور اس کے لیے تایا نے خاور کا انتخاب کیا۔

اماں نے ممتا کا واسطہ دیکر ماہین کو شادی کے لیے راضی کر لیا۔ وہ چپ چاپ قربانی کا بکرا بنی خاور کے گھر چلی گئی۔

خاور ایک عام شکل و صورت کا لڑکا تھا۔ اس نے ماہین کو کسی مقدس چیز کی طرح سنبھال کر رکھا تھا۔ ماہین کو اس کے حد درجہ شریفانہ انداز سے الجھن ہوئی۔ وہ جھجک رہا تھا۔ اس کی شادی کو آٹھ دن ہوئے تھے اور اس آٹھ دن میں اس نے صرف گنتی کے چند جملے ہی بولے تھے جب وہ دعا کے لیے بیقرار ہوئی تو اس نے کہا تھا

’’ آپ دعا کو بھی لے کر آجائیں جب تک آپ یہاں ہیں‘‘

دعا سے خاور کو لگاؤ ہو گیا تھا اور وہ بھی اسے دیکھتے ہی لپک کر اس کی طرف جاتی۔ خاور کے پاس پرسوں تک کا ٹائم تھا وہ ماہین کے پاس آ کر بیٹھ گیا

’’ ماہین ! آپ بہت اچھی ہیں مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ میں نے آپ جیسی سلجھی ہوئی لڑکی کی ہی تمنا کی تھی۔ خیر ! پرسوں آپ یہاں سے چلی جائیں گی۔ اس مختصر سے عرصے میں مجھ سے کوئی بھول چوک ہو گئی تو مجھے معاف کر دیجئے گا۔‘‘

’’ ایک شرط پر معاف کر سکتی ہوں‘‘

’’ جی ۔ کہیے؟‘‘

’’ میری بات مانیں گے؟‘‘

’’ ضرور ! کیوں نہیں ؟ ‘‘

’’ مجھے ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی میں شامل کر لیجیے۔‘‘ خاور کو جھٹکا لگا۔

’’ یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ ؟ میں خائن نہیں بننا چاہتا‘‘

’’ اگر آپ مجھے چھوڑ بھی دیں گے تو میں اشعر کی زندگی میں دوبارہ نہیں جاؤں گی۔ اب فیصلہ آپ پر ہے‘‘

’’ماہین !‘‘ فرطِ مسرت سے اس کی آواز بھرا گئی۔ اس نے ماہین کو پورے استحقاق کے ساتھ گلے لگا لیا۔ یہی تو اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی تھی۔۔

❐❖❐

Fouzia Habeeb
Asistant Professor
Department of Urdu
TAW College for women
Ambur-635802 (Tamilnadu)
Mobile : 7904322597

یاسمین

یادوں کا سفر

رات کی تاریکی آہستہ آہستہ رخصت ہو رہی تھی۔ مشرق کی جانب ہلکی ہلکی روشنی پھیلنے لگی تھی۔ ہوا میں خنکی اور تازگی گھل چکی تھی اور پرندوں کی چہچہاہٹ فضا میں مدھر موسیقی کی طرح گونج رہی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے قدرت نئی زندگی کا پیغام لے کر آئی ہو۔

سورج اب پوری آب و تاب کے ساتھ نمودار ہو چکا تھا اور اس کی سنہری کرنوں نے اندھیرے کو مکمل طور پر مٹا دیا تھا۔ صبح کا وقت واقعی دن کا سب سے پرسکون اور خوبصورت حصہ ہوتا ہے—ایک ایسا لمحہ جب فطرت خود بھی مسکرا اٹھتی ہے، اور دل چاہتا ہے کہ وقت یہیں تھم جائے۔

کلیانی نرم چادر اوڑھے گہری نیند میں سو رہی تھی۔ اچانک گلی محلے سے آتی آوازوں نے اس کی نیند کے تار چھیڑ دیے۔ بچوں کی قہقہوں بھری آوازیں، کسی ریڑھی والے کی پکار، اور دور سے آتی اذان۔ یہ سب آوازیں مل کر جیسے اسے کسی اور دنیا میں لے جا رہی تھیں۔

وہ ہلکے سے کروٹ لے کر جاگ اٹھی۔ کچھ لمحے خاموشی سے لیٹی رہی، جیسے نیند اور بیداری کے درمیان معلق ہو، پھر آہستہ سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

کھڑکی سے باہر کا منظر زندگی سے بھرپور تھا۔ سورج کی روشنی زمین پر اپنے قدم جما چکی تھی۔ درختوں کے سائے میں معصوم بچے کھیل رہے تھے۔ کوئی دوڑ رہا تھا، کوئی ہنس رہا تھا، کوئی ضد کر رہا تھا۔ ان کی ہنسی، ان کی شرارتیں، ان کی بے فکری—سب کچھ کلیانی کے دل کو چھو رہا تھا۔

وہ دیر تک کھڑی انہیں دیکھتی رہی، اور پھر جانے کب اس کی نگاہیں ماضی کے دریچوں میں کھو گئیں۔

گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہوتے ہی اس کے دل میں خوشی کی ایک لہر دوڑ جایا کرتی تھی۔ اسکول کی مصروف زندگی سے چند دنوں کی آزادی جیسے کسی قید سے رہائی ہو۔ آخری پرچہ ختم ہوتے ہی وہ سکون کا سانس لیتی اور چھٹیوں کے خواب بننے لگتے۔

''اس بار ہم ضرور گاؤں جائیں گے!'' وہ خوشی سے اچھل کر امی سے کہتی، اور امی مسکرا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیر دیتیں۔

ان دنوں وہ گاؤں جایا کرتی تھی، جہاں اس کے نانا نانی رہتے تھے۔ گاؤں کی سادہ اور پرسکون زندگی شہر کی بھاگ دوڑ سے یکسر مختلف تھی۔ وہاں پہنچتے ہی ٹھنڈی ہوا اور ہرے بھرے کھیت جیسے اسے اپنی آغوش میں لے لیتے۔

صبح سویرے پرندوں کی چہچہاہٹ اس کی آنکھ کھولتی۔ نانی اماں کی آواز آتی،

''اٹھ جا بیٹی، سورج سر پر آ گیا!'' اور وہ آنکھیں ملتی ہوئی باہر نکلتی تو کچی گلیوں میں پھیلی نرم دھوپ اس کا استقبال کرتی۔

درختوں کے سائے میں کھیلتے بچے، گاؤں کے کنویں کے پاس

جمع عورتیں اور دور کھیتوں میں کام کرتے لوگ۔ یہ سب مناظر اس کے دل میں بس گئے تھے۔

انہی بچوں میں ایک ننھی سی لڑکی بھی تھی۔ معصوم چہرہ، ہونٹوں پر مسکراہٹ، اور آنکھوں میں خواب۔ وہ لڑکی کلیانی خود تھی۔

”کلیانی! ناشتہ کرلو، پھر کھیلنا!“ نانی اماں کی محبت بھری آواز گونجتی، مگر وہ کہاں سننے والی تھی۔

کبھی گڑیوں کا کھیل، کبھی لکا چھپی، کبھی گلی ڈنڈا۔ وہ ہر کھیل میں یکساں مگن رہتی۔

کبھی ہار کر روتی، کبھی جیت کر قہقہے لگاتی۔

شام ہوتے ہی سب بچے تھک کر بیٹھ جاتے، مگر اس کی توانائی ختم ہونے کا نام نہ لیتی۔

نانی کے ہاتھ کے گرم گرم پراٹھے، مکھن اور تازہ دودھ۔ یہ سب اس کے لیے کسی نعمت سے کم نہ تھے۔ نانا کی کہانیاں، جن میں کبھی دیو ہوتے، کبھی پریاں۔ وہ ان کہانیوں میں کھو جایا کرتی تھی۔

اس کی دنیا چھوٹی سی تھی، مگر خوشیوں سے لبریز۔

اسی لمحے جیسے کسی نے اس کے دل میں ایک دھیمی سی صدا جگائی:

نہ کوئی فکر تھی ، نہ کوئی غم تھا

بچپن کا زمانہ بھی کیا عجب تھا

اچانک کلیانی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور وہ حال میں لوٹ آئی۔ کھڑکی کے باہر اب بھی بچے کھیل رہے تھے، مگر اسے یوں لگا جیسے وہ سب اس سے بہت دور ہو گئے ہوں۔

اس نے آہستہ سے بستر کی طرف قدم بڑھائے اور بیٹھ گئی۔ کمرے کی خاموشی میں اس کے دل کی دھڑکنیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

وہ سوچنے لگی۔ بچپن واقعی زندگی کا سب سے قیمتی خزانہ ہوتا ہے۔ ایک ایسا خزانہ جو ایک بار کھو جائے تو پھر کبھی واپس نہیں آتا۔

اس نے دل ہی دل میں دعا کی، ”کاش وہ دن لوٹ آئیں...... جب نہ کوئی فکر تھی، نہ کوئی ذمہ داری..........صرف خوشیاں تھیں، ہنسی تھی، اور مٹی کی خوشبو تھی۔"

اس کی نظر کمرے کے ایک کونے میں پڑی جہاں اس کی بیٹی کی چھوٹی سی گڑیا رکھی تھی۔ وہ کچھ لمحوں کے لیے اسے دیکھتی رہی، پھر ہلکے سے مسکرا دی۔ شاید زندگی کا دائرہ یہی ہے، ایک نسل کی کہانی دوسری نسل میں زندہ رہتی ہے۔

مگر حقیقت اس کے سامنے تھی۔ اب وہ بڑی ہو چکی تھی۔ زندگی کی دوڑ، ذمہ داریوں کا بوجھ، اور وقت کی تیز رفتاری۔ سب کچھ اس کے حصے میں آ چکا تھا۔

دنیا کی مصروفیات نے اسے اس معصوم دنیا سے بہت دور کر دیا تھا۔ اب وہ دن صرف یادوں میں باقی رہ گئے تھے، لیکن ان یادوں کی مٹھاس اب بھی اس کے دل میں زندہ تھی۔

”کلیانی! ابھی تک سو رہی ہو؟ کھانا کون بنائے گا؟ برتن کون دھوئے گا؟“

کمرے کے باہر سے ساس کی تیز آواز گونجی، جس میں شکایت بھی تھی اور حکم بھی۔

یہ آواز کسی کڑوی حقیقت کی طرح اس کے خوابوں کو توڑ گئی۔ کلیانی چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے جلدی سے آنسو پونچھے، دوپٹہ سنبھالا اور باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔

چولہے کے پاس کھڑے ہو کر جب اس نے آگ جلائی تو شعلوں کی تپش نے جیسے اس کے اندر کی خاموشی کو بھی جلا دیا۔

برتنوں کی کھنک، پانی کی آواز، اور ساس کی ہدایات۔ یہ سب اس کی روزمرہ زندگی کا حصہ تھے۔

اب وہ وہی ننھی سی لڑکی نہیں رہی تھی۔ وہ ایک ذمہ دار عورت بن چکی تھی۔ گھر کی چار دیواری میں بند، فرائض کے بوجھ تلے دبی ہوئی۔

مگر اس کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ شاید اس لیے کہ آج اس نے اپنے بچپن کو ایک بار پھر جی لیا تھا۔

اسی کیفیت میں جیسے اس کے دل کی ترجمانی کرتے ہوئے خواجہ میر درد کا ایک شعر اس کے ذہن میں گونج اٹھا:

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے

ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے ...

دوپہر ڈھلنے لگی۔ کلیانی نے ایک لمحے کو رک کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ بچے اب بھی کھیل رہے تھے۔ وہی شور، وہی ہنسی، وہی زندگی۔

اس نے دل میں ایک عجیب سا سکون محسوس کیا۔ شاید زندگی پوری طرح بدلتی نہیں، بس کردار بدل جاتے ہیں۔

کلیانی نے چولہے کی آنچ دھیمی کی اور اپنے کام میں لگ گئی، مگر اس کے دل کے کسی کونے میں وہی ننھی سی بچی اب بھی زندہ تھی، جو کبھی گاؤں کی گلیوں میں بے فکر دوڑا کرتی تھی۔

اور شاید............

ہمیشہ زندہ رہے گی۔

کلیانی نے آہستہ سے چولہے پر رکھی دیگچی کو ہلایا۔ سالن کی خوشبو پورے کچن میں پھیل گئی، مگر اس کے ذہن میں اب بھی ماضی کی مہک بسی ہوئی تھی۔

مٹی کی خوشبو، آم کے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں، اور نانی اماں کے آنگن کی وہ مانوس سی فضا۔

”دوپہر کے بعد جب گھر کے کام کچھ کم ہوئے تو کلیانی نے تھکے ہوئے قدموں سے کمرے کا رخ کیا۔ اس کی بیٹی فرش پر بیٹھی اپنی گڑیا سے کھیل رہی تھی۔ کبھی اسے سجاتی، کبھی اس سے باتیں کرتی، اور کبھی ہنستے ہنستے خود ہی لوٹ پوٹ ہو جاتی۔“

وہ کام کرتے کرتے کبھی رک جاتی، جیسے کسی انجانی آواز نے اسے پکارا ہو۔ ایک لمحے کو یوں محسوس ہوتا جیسے نانی اماں پھر سے آواز دے رہی ہوں :

” کلیانی بیٹی، ذرا یہ پانی بھرلا.................. “

وہ چونک کر حال میں لوٹ آتی اور ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آجاتی۔

یادیں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ نہ مکمل طور پر ساتھ چھوڑتی ہیں، نہ پوری طرح واپس آتی ہیں۔ بس دل کے کسی گوشے میں چراغ کی مانند جلتی رہتی ہیں۔

”کلیانی نے گڑیا کو ہاتھ میں لیا، اس کے چھوٹے چھوٹے کپڑے سنوارے، اور اچانک اس کی آنکھوں کے سامنے اپنا بچپن گھوم گیاوہی گڑیوں کی شادیاں، وہی سہیلیوں کا شور، وہی ننھی ننھی خوشیاں“

دوپہر کے بعد جب گھر کے کام کچھ کم ہوئے تو کلیانی نے تھکے ہوئے قدموں سے کمرے کا رخ کیا۔ اس کی بیٹی فرش پر بیٹھی اپنی گڑیا سے کھیل رہی تھی۔ کبھی اسے سجاتی، کبھی اس سے باتیں کرتی، اور کبھی ہنستے ہنستے خود ہی لوٹ پوٹ ہو جاتی۔

کلیانی دروازے پر کھڑی اسے دیکھتی رہی۔

ایک لمحے کے لیے اسے یوں لگا جیسے وقت نے ایک دائرہ مکمل کر لیا ہو۔

وہی کھیل، وہی معصومیت، وہی بے فکری... فرق صرف اتنا تھا کہ کردار بدل گئے تھے۔

وہ آہستہ سے آگے بڑھی اور بیٹی کے پاس بیٹھ گئی۔

” کیا بنا رہی ہو بیٹا؟ اس نے پیار سے پوچھا۔

بچی نے معصومیت سے جواب دیا،

” امی، میں اپنی گڑیا کی شادی کر رہی ہوں! “

یہ سن کر کلیانی کے دل میں ایک ہلکی سی چبھن سی ہوئی، مگر اس نے اسے مسکراہٹ میں چھپا لیا۔

” اچھا! تو میں بھی مدد کروں ؟ “

بچی خوشی سے اچھل پڑی۔

” ہاں امی ! آپ دلہن بنائیں ! “

کلیانی نے گڑیا کو ہاتھ میں لیا، اس کے چھوٹے چھوٹے کپڑے سنوارے، اور اچانک اس کی آنکھوں کے سامنے اپنا بچپن گھوم گیا۔ وہی گڑیوں کی شادیاں، وہی سہیلیوں کا شور، وہی ننھی ننھی خوشیاں۔

کچھ دیر کے لیے وہ واقعی سب کچھ بھول گئی۔

نہ کوئی ذمہ داری، نہ کوئی فکر ...... بس ایک ماں نہیں، بلکہ ایک بچی بن کر اپنی بیٹی کے ساتھ کھیلتی رہی۔

”مگر آج اس کی تھکن میں ایک عجیب سی مٹھاس تھی۔
جیسے کسی نے اس کے دل کے زخموں پر یادوں کا مرہم رکھ دیا ہو۔
اس نے آنکھیں بند کیں تو پھر وہی گاؤں کا منظر سامنے آ گیا۔
کچی گلیاں، کھیتوں کی ہریالی، نانی اماں کی محبت بھری آواز، اور ننھی سی کلیانی جو بے فکر ہنستی دوڑتی پھر رہی تھی۔

شام ڈھلنے لگی۔ آسمان پر سنہری اور گلابی رنگ بکھر گئے۔

کلیانی نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو پرندے اپنے گھونسلوں کی طرف لوٹ رہے تھے۔

یہ منظر دیکھ کر اس کے دل میں ایک عجیب سی کیفیت جاگی۔

جیسے ہر چیز اپنی اصل کی طرف واپس لوٹنا چاہتی ہو۔

اسی لمحے اس کے ذہن میں ایک خیال آیا:

”انسان بھی تو ساری زندگی ایک سفر میں رہتا ہے۔ بچپن سے جوانی، اور پھر بڑھاپے تک۔ مگر دل کہیں نہ کہیں ہمیشہ بچپن میں ہی اٹکا رہتا ہے۔“

رات کا اندھیرا آہستہ آہستہ پھیلنے لگا۔

گھر کے سب افراد اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔

کلیانی نے رات کا کھانا تیار کیا، سب کو کھلایا، برتن سمیٹے، اور پھر تھکے ہوئے بدن کے ساتھ بستر پر آ کر لیٹ گئی۔

مگر آج اس کی تھکن میں ایک عجیب سی مٹھاس تھی۔

جیسے کسی نے اس کے دل کے زخموں پر یادوں کا مرہم رکھ دیا ہو۔

اس نے آنکھیں بند کیں تو پھر وہی گاؤں کا منظر سامنے آ گیا۔

کچی گلیاں، کھیتوں کی ہریالی، نانی اماں کی محبت بھری آواز، اور ننھی سی کلیانی جو بے فکر ہنستی دوڑتی پھر رہی تھی۔

اس نے آہستہ سے خود سے کہا:

”وقت بدل جاتا ہے ...... مگر احساسات نہیں بدلتے۔“

پھر اس کے لبوں پر بے اختیار ایک اور شعر آ گیا:

وہ بچپن کے دن بھی کیا دن تھے
نہ سوچ کا بوجھ، نہ کل کا ڈر تھا

آنکھوں کے کنارے نم ہو گئے، مگر اس بار ان آنسوؤں میں صرف غم نہیں تھا۔ ایک عجیب سا سکون بھی شامل تھا۔

اس نے کروٹ بدلی اور اپنی بیٹی کو اپنے قریب سوتا دیکھا۔

وہ آہستہ سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی، جیسے نانی اماں کبھی اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی تھیں۔

اسی لمس میں اسے ایک تسلی ملی۔

شاید زندگی یہی ہے ....

یادوں کو سنبھالنا، حال کو جینا، اور آنے والے کل کے لیے محبت چھوڑ جانا۔

کمرے میں خاموشی گہری ہو گئی۔

باہر کہیں دور کتوں کے بھونکنے کی آواز آ رہی تھی، اور رات اپنی چادر پوری طرح پھیلا چکی تھی۔

کلیانی کی آنکھیں بوجھل ہونے لگیں۔

نیند کی آغوش میں جانے سے پہلے اس کے دل میں ایک آخری خیال ابھرا:

”بچپن کبھی ختم نہیں ہوتا ....

وہ صرف یادوں میں منتقل ہو جاتا ہے۔“

اور اسی خیال کے ساتھ وہ نیند کی وادی میں اتر گئی۔

جہاں شاید وہ پھر ایک بار گاؤں کی گلیوں میں دوڑ رہی تھی......

بے فکر، بے پرواہ، اور مسکراتی ہوئی۔

Yasmeen
Research Scholar
University of Hyderabad
Gachibowli, Hyderabad 500046, Telangana
Email id yimahcu10@gmail.com

ارتباط

ماہنامہ خاتون دنیا مئی 2026 کا شمارہ دیکھا۔ سبھی مضامین اچھے ہیں تاہم شمیم حنفی کی ڈرامہ نگاری پر سیمیں فلک کا مضمون پسند آیا۔ سیمیں فلک کی یہ بات بالکل صحیح لگی کہ شمیم حنفی کے ''ڈراموں میں بنیادی طور پر وجودی فکر، ہجرت کے زائیدہ مسائل، نئی پرانی نسلوں کے مابین طرز خیال اور رویے کا فرق، وقت کا فلسفہ، ماضی سے شدید وابستگی اور ماضی اور حال کی کشمکش، نئی پرانی قدروں کا تصادم اور انسانی دریافت وانکشافات کے بھیانک نتائج وغیرہ کو موضوع بنایا گیا ہے۔'' ص26

ہندی ناول 'مائی' پر ہما کا مضمون ناول کو سمجھے کی ایک سنجیدہ کاوش ہے۔

اس شمارہ میں مضمون 'اکیسویں صدی میں طنز و مزاح کی اہمیت واثرات' پڑھتے ہوئے خیال آیا کہ آپ 'خواتین دنیا' میں طنز ومزاح کیوں نہیں چھاپتے۔ طنز ومزاح انسان کے ذہن وروح کی ضرورت ہے۔ فرحین شکیل سحر کی نظم کا عنوان اگر چہ ایک مشہور نظم سے لیا گیا ہے لیکن اس نظم میں ایک نیا پن ہے۔ پوری نظم متاثر کن ہے۔ بالخصوص اس کی یہ لائنیں

موت کا غم ہے بچھڑنے کی سزا بھی ہے یہاں
جیتے جی روز ہی مرنے کا مزہ بھی ہے یہاں
بیوگی بھی ہے یتیمی ہے بڑھاپا ہے یہاں
ہر خوشی رنج و الم کا ہی سراپا ہے یہاں
بھائی نے بھائی کا غم حیف اٹھایا ہے یہاں
کتنے اپنوں کو تہِ خاک سلایا ہے یہاں
مفلسی بھی ہے یہاں بھوک بھی ہے لاچاری ہے
نسل انسان پہ انسان کا خوں طاری ہے

مائرہ شیخ، نئی دہلی

❐❖❐

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی تازہ مطبوعات

ادبیات شناسی

مصنف: محمد حسن

دوسرا ایڈیشن: 2026

صفحات: 192

قیمت: 120 روپے

زبان اور علم زبان

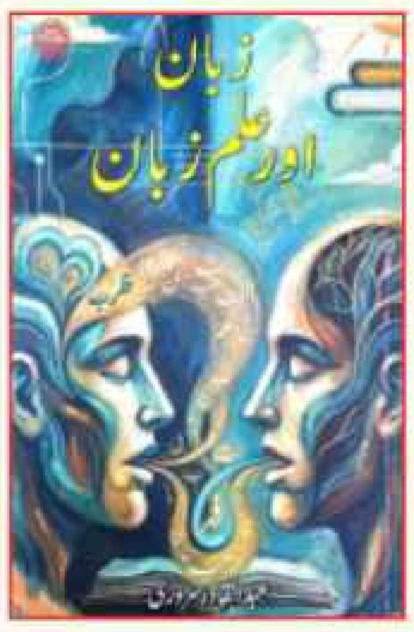

مصنف: عبدالقادر سروری

پہلی اشاعت: 2026

صفحات: 270+XVII

قیمت: 190 روپے

سہانی دھوپ

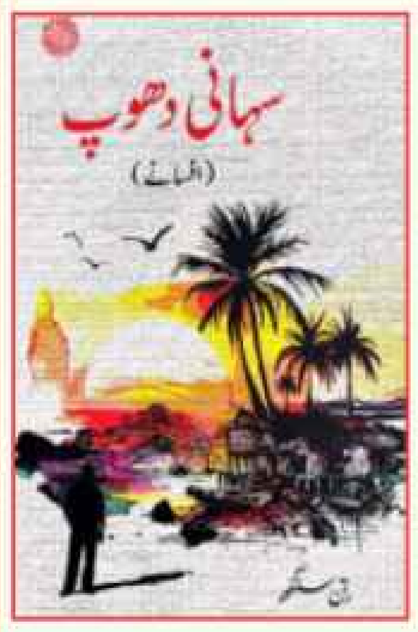

مصنف: رتن سنگھ

پہلی اشاعت: 2026

صفحات: 494+IX

قیمت: 305 روپے

جراحیاتِ نظامی

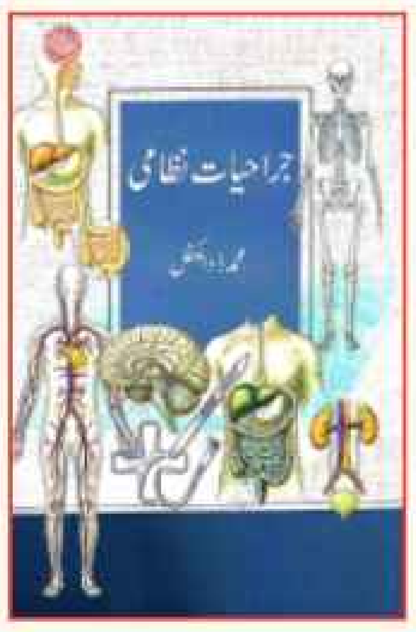

مصنف: محمد ذوالکفل

پہلی اشاعت: 2026

صفحات: 358+IV

قیمت: 275 روپے

خواتین واطفال سے متعلق قوانین (جلد اوّل: خواتین سے متعلق قوانین)

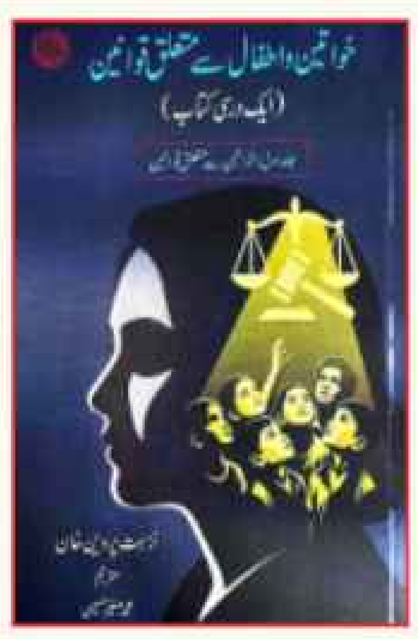

مصنفہ: نزہت پروین خان

مترجم: محمد صغیر حسین

پہلی ایڈیشن: 2026

صفحات: 678+X

قیمت: 405 روپے

خواتین واطفال سے متعلق قوانین (جلد دوم: اطفال سے متعلق قوانین)

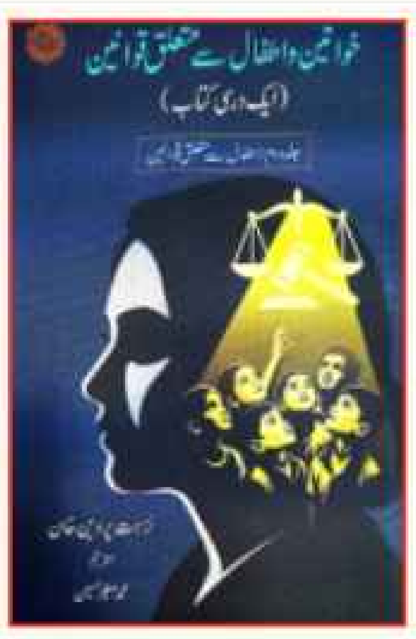

مصنفہ: نزہت پروین خان

مترجم: محمد صغیر حسین

پہلی اشاعت: 2026

صفحات: 318

قیمت: 210 روپے

منجدھار میں دھار

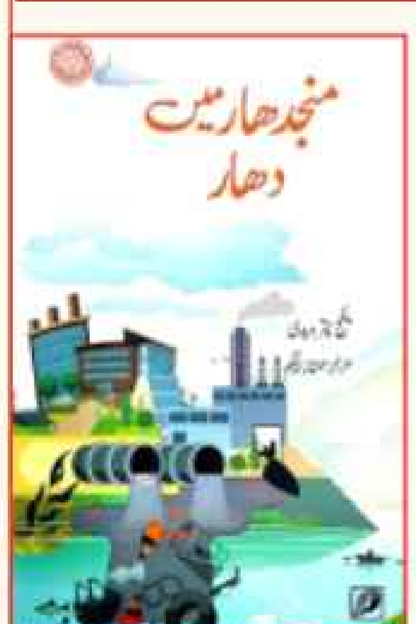

مصنف: پنکج چترویدی

مترجم: ممتاز بیگم

پہلی اشاعت: 2026

صفحات: 178+XXII

قیمت: 280 روپے

زراعت کو آب وہوا میں ہونے والی تبدیلی کے مطابق بنانا

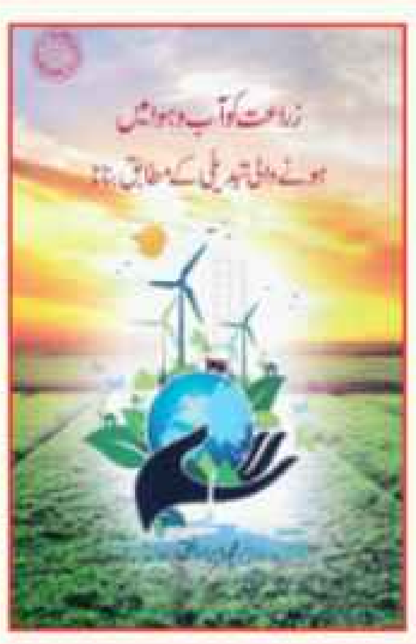

مصنف: محمد اسرار الحق

پہلی اشاعت: 2026

صفحات: 72+XVI

قیمت: 120 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

माहनामा ख्वातीन दुनिया मासिक, जून -२०२६ वर्ष: १०, अंक: ६
Mahnama Khawateen Duniya Monthly June 2026, Vol.10 Issue:6
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI. No. DELURD/2017/74026
DL (S)-17/3555/2024-26
ISSN 2581-4826
Date of Publication: 13-06-2026
Date of Dispatch : 14 and 15 of every month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

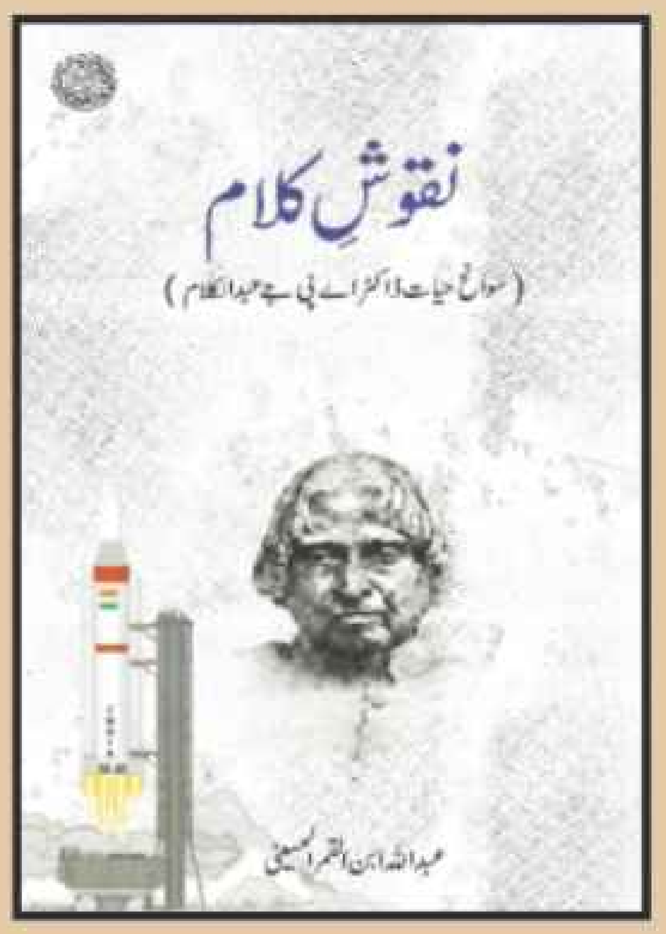

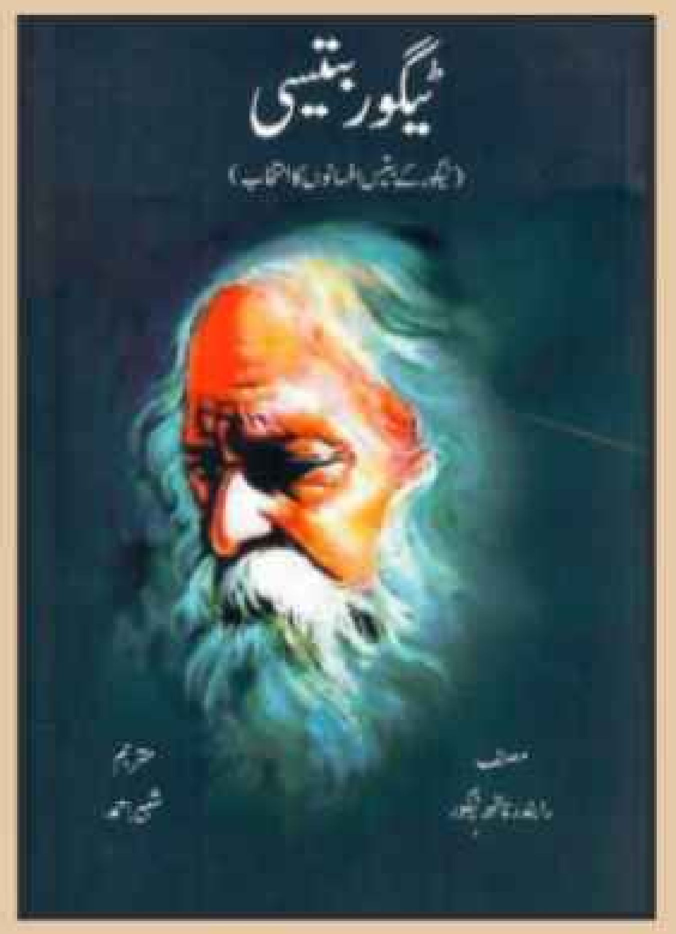

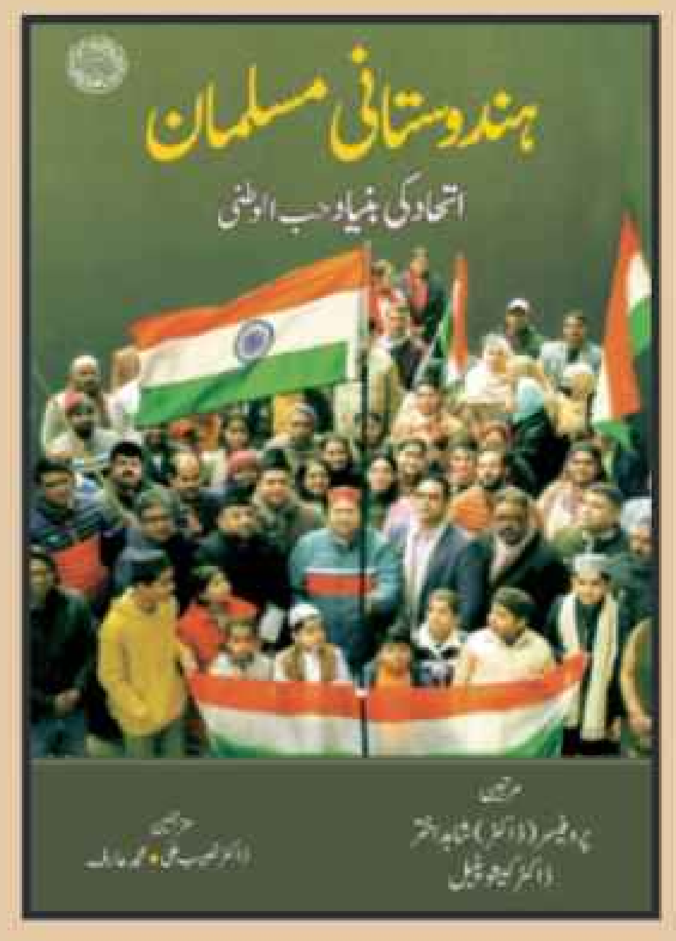

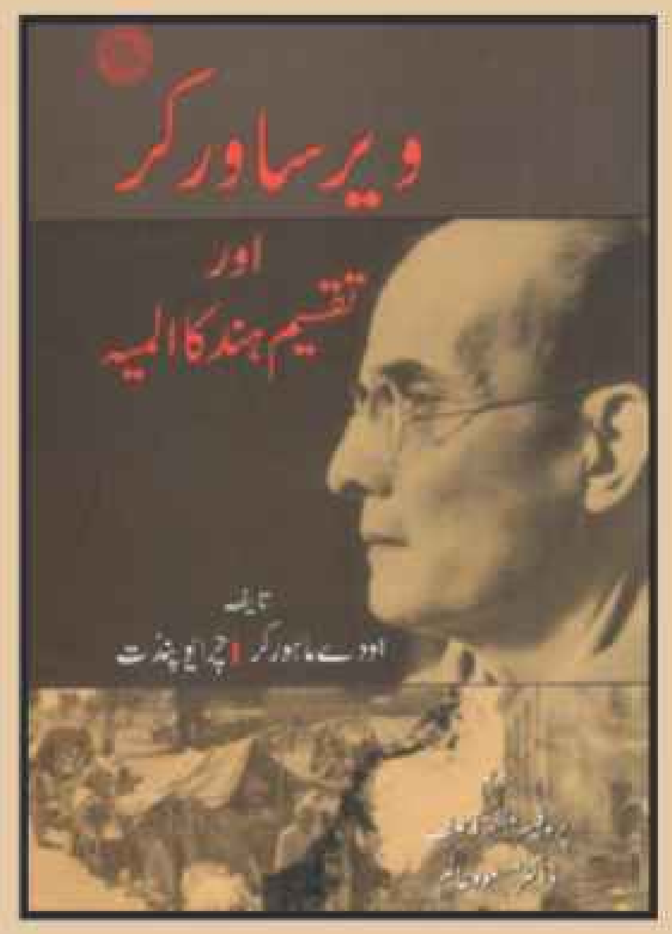

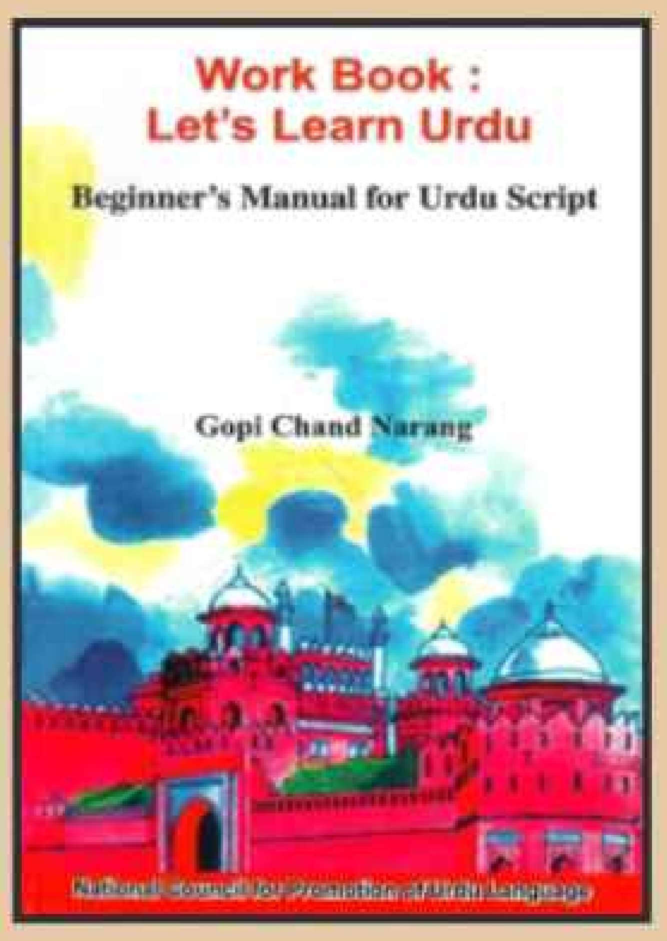

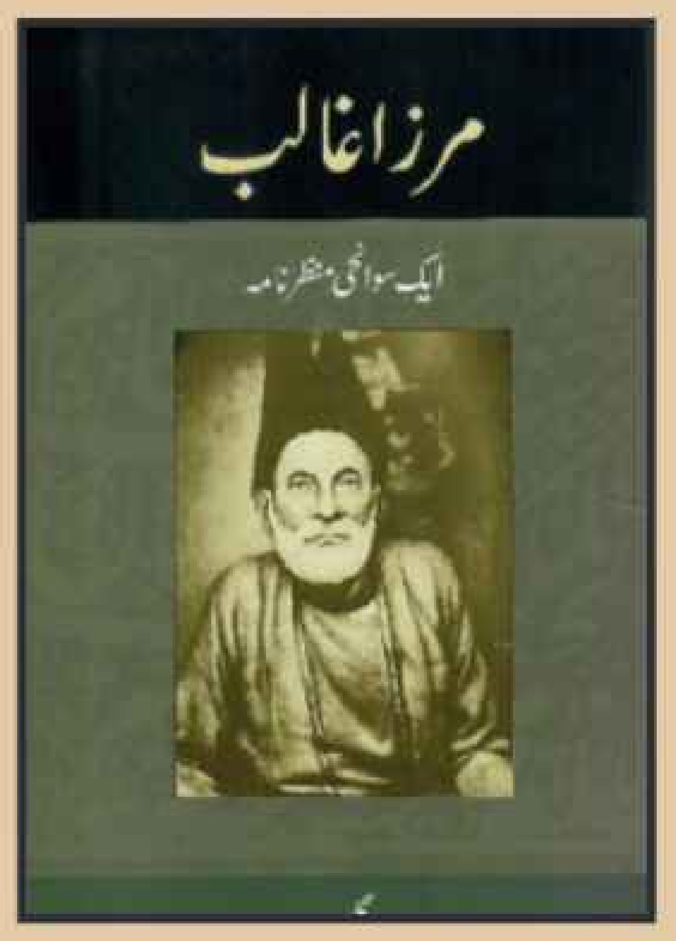

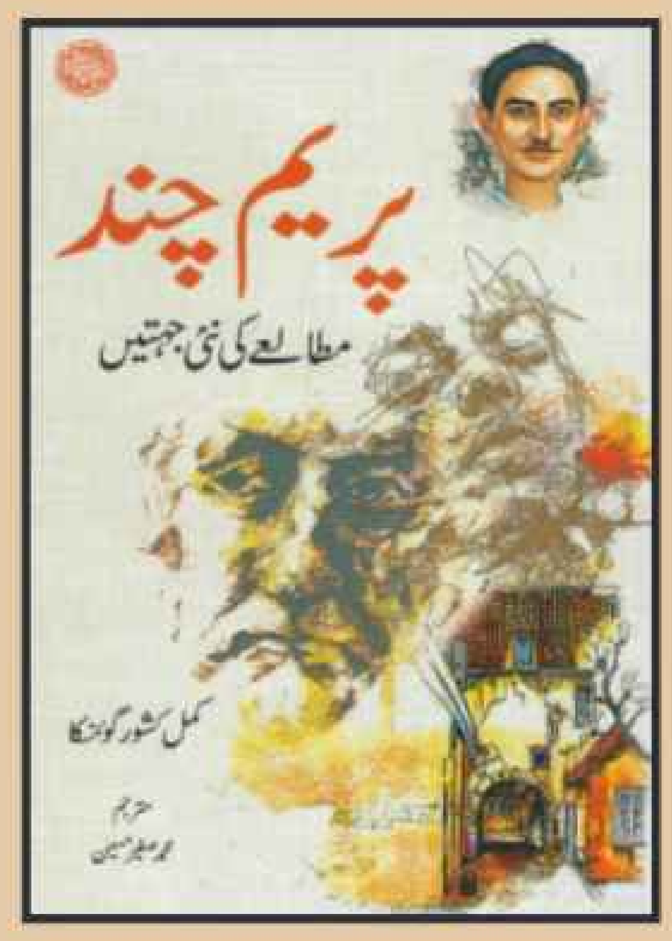

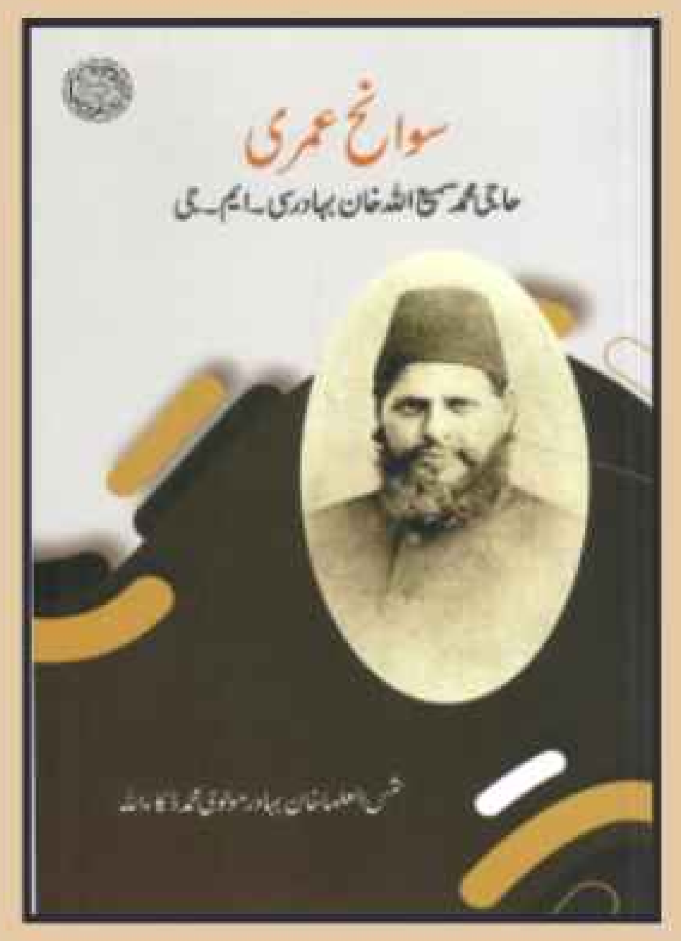

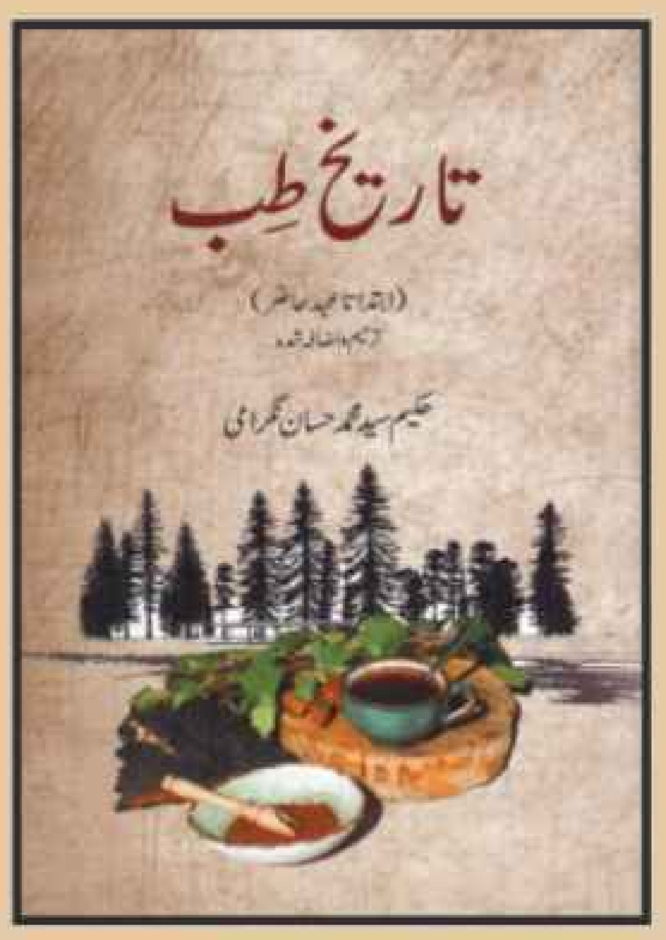

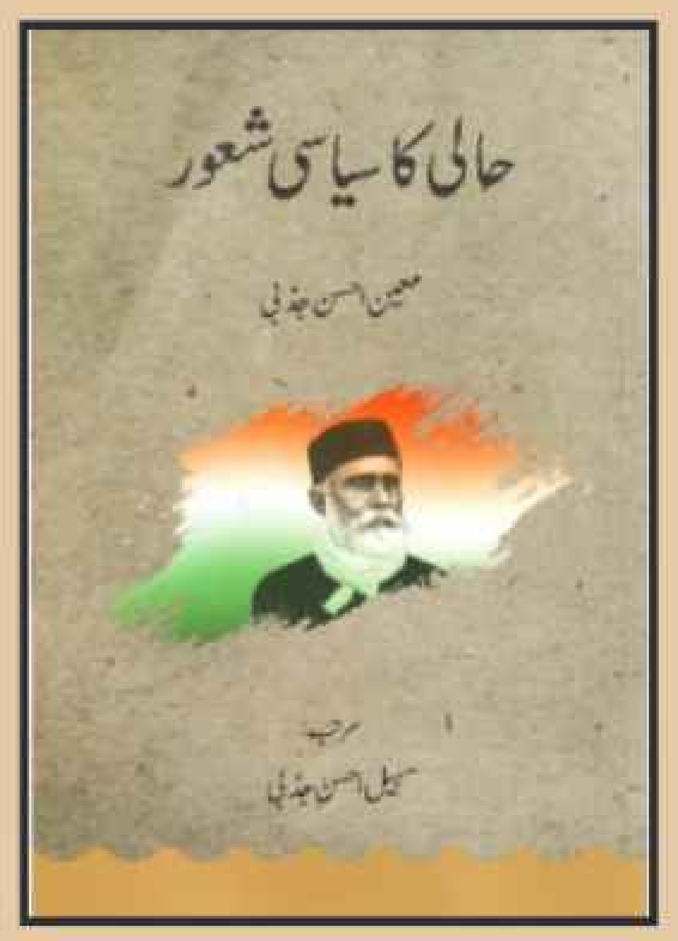

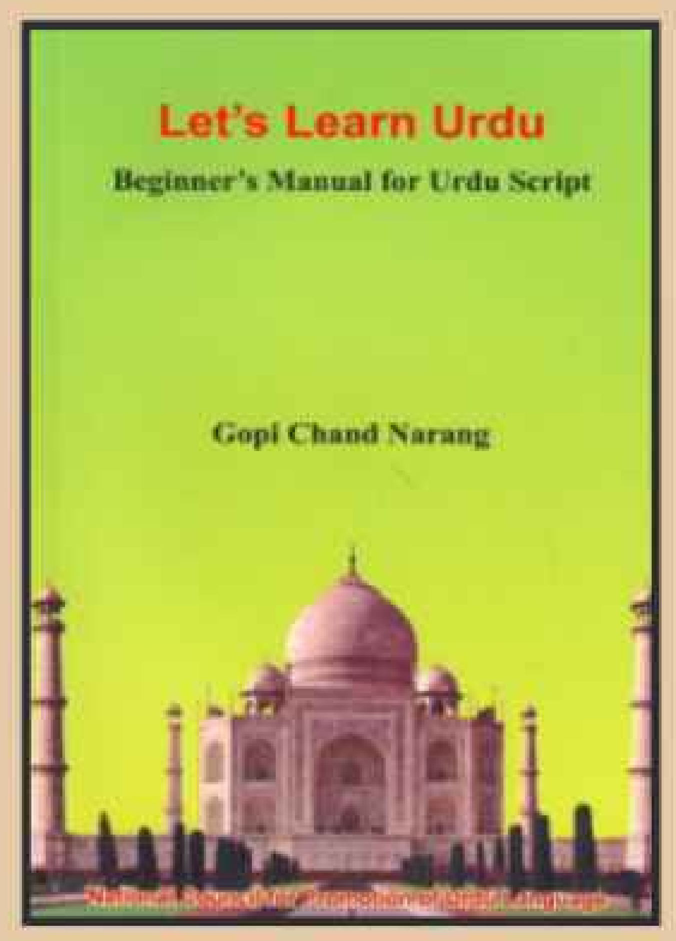

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Md. Shams Equbal, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at Makoff Printers, B-127, Sector 65, Noida-201301 (U.P)
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025